بازارِ حیات
احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی

○

اساطیر لاہور

کتاب	بازار حیات (افسانے)
مصنف	احمد ندیم قاسمی
اہتمام	منصورہ احمد (اساطیر)
کتابت	محمد اکرام
سرورق	شاہنواز زیدی
مطبع	نقوش پریس اردو بازار، لاہور
سنہ اشاعت	1995ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	140/ روپے
ناشر:	

مکتبہ اساطیر A-45 مزنگ روڈ، لاہور۔

چھوٹی بہن

عابدہ

کے نام

ع

تمہارے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
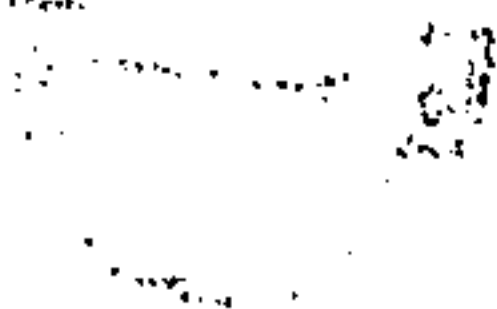
فہرس

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا" کسی نے کہہ دیا "ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔" اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف رینگتی چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا" وہ سوچتی "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پا کر رویا ہوگا اور پھر ——— پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے، پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے، آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی ———"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل اُدھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال جب وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا تھا "میں نعرۂ تکبیر مار دوں گا" ——— اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا، وہ بولا "ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے

جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا۔" ذرا ٹھہر پرمیشرے، کرپان اپنا دھرم پورا کر لے، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔" اسے مارو نہیں۔ اتنا ذرا سا تو ہے، اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ جس نے ——"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔" بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے، منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔" پتہ نہیں۔"

"لو اور سنو" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا۔" اماں تو کہتی ہے ہمیں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

سب سکھ ہنسنے لگے مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے، اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔" سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا۔" لے پرمیشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے، لے پکڑ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں

کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنہوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اُتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دُور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے، دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سُرخ آنکھوں میں چمک تھی، اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو!"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند لی۔ "آہا!" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ "تتلی!"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

"لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اُڑ گئی۔ اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اُداس ہو گیا۔ اور پرمیشر سنگھ دُوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو۔ اکرتارے کی تتلی بھی اُڑ جاتی تھی تو یوں ہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ

واپس جانے لگا۔
پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا "ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے یہ کہا کہ "ہاں ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لئے چلتا ہوں۔" تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔
پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں تھیں اور وہ بڑی پُراسرار سرگوشی میں بولا تھا۔ "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!"
گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے "جانے کیا ہو گیا ہے اسے!" اس نے کہا تھا "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو دہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا۔ اور جب سے کرتار سنگھ سے بچھڑا ہے تو میں تو خیر رو دھو لی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی، بپھر جاتا تھا۔ کہتا تھا 'بیٹی کو بُرا مت کہو، بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بیچاری۔ ہمارے گھر وندے میں ستانے بیٹھ گئی، وقت آئے گا تو چلی جائے گی' ——— اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"
وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں

بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اُٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" —— بیوی اسے محض "اونہہ" سے ٹال کر سو جاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھوٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا۔ اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اُجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی، اذان کا تصور تک اسے خوف زدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا۔ "ٹھیک ہے سوتے نہیں تو اور کیا کرے، نکمی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔"

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلافِ معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکنے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی، اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پر سے کودتی ہوئی آئی اور بولی "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈرو نہیں بے وقوف! اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں، یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے۔"

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی۔ "اور پھر کیسوں کا کیا ہے،

دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"پر یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "واہگورو جی کا ہے۔ ہمارا اپنا ہے اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، یہ کرتارے ہی کا تل ہے کہ تارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے۔ اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں، اور ——"

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا۔ "ہم یہاں نہیں رہیں گے، ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ "اری لو۔ یہ اماں پاس جانا چاہتا ہے۔"

"تو جاتے۔" بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آگیا تھا جسے کرتار سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ "ڈاکہ مارنے گیا تھا سورما۔ اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اُٹھا لاتا تو ہزاروں میں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اُجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا۔ اور پھر —— پگلے —— تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مُسلا ہے؟ جہاں سے اٹھا لاتے ہو وہیں ڈال آؤ۔ خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی۔ "کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ سمجھیں؟"

"نہیں" اب کے بیوی چیخ اُٹھی۔ "میں نہیں سمجھی، نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، میں رات

ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے لے جا اسے، پھینک دے باہر۔"

"نہیں نہ پھینک دوں باہر؟" اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔ "تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا۔ اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی، چیختی چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو دہلا دیا۔ "اختر کدھر گیا؟" وہ چنگھاڑا۔ "ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو۔ اختر۔ اختر!" وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یارو۔ ارے وہ گیا کہاں۔ اختر۔ اے اختر۔"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے، روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ "تم تو سکھ ہو۔"

"ہاں بیٹے۔ سکھ تو ہوں۔" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعترافِ جرم کر لیا۔

"تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کرنئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا۔

"نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"نہیں۔"

"نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

"کیسے نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے تھپّڑ مار دیا "چلو" وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے۔ پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا "نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا"

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچّے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچّوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچّوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچّوں کی سی رونی آواز میں بولا "مجھے مُعاف کر دے اختر مجھے تمہارے خُدا کی قسم۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا۔ پھر تمہاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں —— اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتارا نام کا۔ تو تم اُسے اِدھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا، اچھا؟"

"اچھا!" اختر نے اُلٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ "روتے کیوں ہو پرمیشرے، کُل ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا"

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رُک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا "تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو۔ اور اگر اُدھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا" پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی "یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے

انگریزی بال بنوا لاؤں گا تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، خالصہ ہوں۔ سینے میں شیر کا دل ہے، مُرغی کا نہیں۔"

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا۔ اور بولا۔
"پرمیشر سنگھا!"

"جی" پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔
"دیکھو" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی، چھوگئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"
"جی!" پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا
"ہاں!" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔
"ایسا ہی ہوگا گرنتھی جی" پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی "پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے، لگتا ہے پہلے جنم میں مُسلا رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سُنا ہے کہ ہمارے گھر میں مُسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے، موا نکما۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔"

"واہگورو جی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی" پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا، کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آ گیا۔
"اچھا جی۔ اچھا" اس نے کہا۔ اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے الگ پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لوؤں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی۔ وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر پر آ کر پگڑی اتارتا تھا۔ تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ

رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی "ذرا ادھر تو آ امر کورے! یہ دیکھ۔ کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جُوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔"

"نہیں ماں" امر کور وہیں سے جواب دیتی "جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاندا ایک ہے۔ اسی طرح کرتارا بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی "میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں یہ مُسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مُسلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتارا ہے۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لئے روتیں۔ اختر چند روز اپنی اماں کے لئے روتا رہا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا "میرے سر پر پگڑی باندھ دو پرموں۔ میرے کیس بڑھا دو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔"

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا دیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا "یہ سب ہو جائے گا بیٹے۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات نہیں ہو گی۔ وہ بات کبھی نہیں ہو گی وہ نہیں ہو گا مجھ سے، سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔"

اختر اپنی ماں کو بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دیا۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت

کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا۔ اور امر کور کو بڑی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اُٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا۔ "الو کی پٹھی" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ "سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اُٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یارو" اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دوچند ہو گئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ "پانی" اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں، ادھر اُدھر دیکھا اور "پانی" کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اُٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ "پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھویں سیکڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جُٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا "پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ میں ماروں گا"۔ ... امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں، بولی۔ "مار تو سہی۔ تو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہ لوں گی، میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی"۔ اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدّت کے بعد اس نے اپنی اماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بُری حالت بنائی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سؤر کی بچّی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے"۔ پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصّے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی "کیوں پانی پلاؤں۔ کرتارا بھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر۔ ہاں!"

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی تو تمہاری آماں ہے بیٹے۔"

"نہیں"۔ اختر بڑے غصے سے بولا۔" یہ تو سکھ ہے۔ میری آماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا۔" تمہارے ہاتھ سے نہیں پیئں گے، تم تو امر کور سوّر کی بچّی کی اماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پیئں گے۔"

"یہ بھی تو مجھی سوّر کی بچّی کا باپ ہے!" امر کور نے جل کر کہا۔

"تو ہوّا کرے!" اختر بولا۔" تمہیں اس سے کیا۔"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا۔ اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔

"اری سنتی ہو؟ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

بیوی نے پہلے تو اسے پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا مگر پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی۔" بیٹی۔"

"کیا ہے ماں۔" امر کور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔" سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی

سے بھینچ لیا۔ "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں" اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا "کوئی چیز چیخی تھی۔"

"امر کور چیخی تھی۔" پرمیشر سنگھ نے کہا "ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا!" اختر بولا۔

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر دہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اُڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی "میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟ پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھُو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مُسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا "تمہارے سینے پر بھی چھُو کر دُوں۔"

"ہاں ہاں" پرمیشر سنگھ نے گریباں کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھُو کر دی۔

اُب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابُو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا "کیا نیند نہیں آتی تھی؟"

"ہاں!" اختر بولا "اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے۔ نیند نہ آئے تو تین بار قل ہو اللہ پڑھو، نیند آ جائے گی۔ اَب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کے سو جاؤ۔" پرمیشر سنگھ نے کہا "روز پڑھا کرو، اُونچے اُونچے پڑھا کرو اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امر کور پکاری

"نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے؟"

"ڈر لگتا ہے؟" پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"جلتا رہے۔ کیا ہے؟" بیوی بولی

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا۔ "پگلیاں"۔ وہ بولا۔ "گدھیاں"۔

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خرّاٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچّی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے۔ اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا۔ اور قل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں"

"کرتارا؟"

"نہیں"۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "ہاں ہاں وہی، کرتارا"۔

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا"۔

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دے رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے، مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری

ہے، پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا۔
"کیوں بے کرتارو۔ تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا!" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا
اختر ایک لمحے کے لئے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مُسلا!" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھڑا!" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا "سنو بیٹے میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سُرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا" اختر نے معمّے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کئے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا "دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے۔ آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ تم کہیں چھپ جاؤ، پھر جب وہ چلے جائیں گے نا تو میں تمہیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولا دکھائی دیا، مینڈھ پر چڑھ کر اس نے بلند ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا۔

"فوجیوں کی لاری آگئی"—— وہ مینڈھ پر سے کود پڑا۔ اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا "گیانے۔ او گیان سنگھ!" وہ چلّایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا "تو آؤ بھی کرتار ے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں۔ ہونہہ!"—— پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی "جاؤں ؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے اِدھر اُدھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رُک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبر دار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں "لڑکے کی بات دوسری ہے" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیرِ لب مسکرانے لگے پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اُس نے اس مامتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں اُن سے ہتھیائی گیئں تھیں " اور مذہب کا کیا ہے دوستو" اس نے کہا تھا "دُنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چرا لیتے ہو۔ ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں"—— ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں، ہم رسول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا۔ ان سے

ہاتھ ملایا۔ اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارکباد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد لٹا لٹا سا الگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اُسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا، کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ "ہائے اتنا بڑا کانٹا اُتر گیا پورے کا پورا۔" وہ چلایا۔ اور پھر اس کی ماں ننگے سر اُوپر بھاگی۔ اُسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری۔ "ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اُوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ "سنو۔ کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"لو اور سنو!" بیوی بولی۔ اور پھر ایک دم جھاجوں رو دی۔ "کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے۔"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اُٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر سنگھ یوں بدک کر جلدی سے اُٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا۔ "آج تو دن بھر خوب سوتے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔

کھیتوں میں آ کر وہ بولا "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے۔ یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا۔ یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمہاری اماں کے دیس میں۔"

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔"

اب کے اختر بولا۔ "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟"

"ہاں" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ "چلو گے اماں کے پاس؟"

"ہاں" اختر بولا۔ "پر تم لے تو جاتے نہیں، تم بہت برے ہو۔ تم سکھ ہو۔"

پرمیشر سنگھ بولا۔ "نہیں بیٹے، آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لئے اداس ہوں۔"

"میں بھی تو اداس ہوں۔" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لئے جا رہا ہوں۔"

"سچ؟" اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا۔ "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے۔"

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روتے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا۔ "گانا سنو گے؟"

"ہاں"

"پہلے تم قرآن سناؤ"

"اچھا" اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھو کی اور بولا۔ "لاؤ تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔"

رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور ادھر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس

کے سینے پر چھو کر دی اور بولا "اب تم سناؤ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا اس لئے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کئے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ورگا ہے
بنتو دا منہ چن ورگا ہے
بنتو دا لک چترا ہے
لوکو
بنتو دا لک چترا

"بنتو کون ہے؟" اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا "میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام بنتو ہے، امر کور کا نام بھی بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" اختر خفا ہوگیا۔ "وہ کوئی سکھ ہے!"

پرمیشر سنگھ خاموش ہوگیا۔

چاند بہت بلند ہوگیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گورو گوبند کی کہانی تھی۔ لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا۔ اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا "ارے چاند تو سر پر آ گیا!"

پرمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا۔ اور بولا "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا۔"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دُور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کُودا کہ پرمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوتے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "جاؤ بیٹے۔ تمہیں تمہاری اماں نے پُکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں ــــ"

"شش!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی۔ اور سرگوشی میں بولا "اذان کے وقت نہیں بولتے۔"

"پر مَیں تو سکھ ہوں بیٹے!" پرمیشر سنگھ بولا

"شش!" اب کے اختر نے بگڑ کر اُسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم ــــــ"

"کیوں؟ کیوں نہیں آؤ گے؟" اختر نے پوچھا

"تمہاری اماں نے چِٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔" پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا۔ "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا کرتارا نہیں۔ اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو۔ مجھے ایک چِٹھی ضرور لکھنا۔"

"لکھوں گا۔" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں تمہیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے نا تو اسے اِدھر بھیج دینا۔ اچھا؟"

"اچھا۔"

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چُوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا "جاؤ۔"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا۔ "تم بھی آجاؤ نا۔"

"نہیں بھئی" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا۔ "تمہاری اماں نے چِٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔
"اچھا" بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور وہ قل ہو اللہ کا وِرد کرتا ہوا جانے لگا۔
نرم نرم پو اُفق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دُھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصّہ بن گیا تو وہ وہاں سے اُتر آیا۔
اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے "کون ہو تم؟"
"اختر!" وہ یوں بولا جیسے ساری دُنیا اس کا نام جانتی ہے۔
"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔
اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر سَر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا "میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں ماروں گا۔"
ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھب سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے "ہالٹ!" ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اُجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلّاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔
سپاہی جب ایک جگہ جا کر رُکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا "مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"
دُور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

گُل رُخے

مطلب میں داخل ہوتے ہی اس کی صورت پر ٹوٹ برسنے لگی۔ "ڈاگدار صاب!"
وہ بولا اور اس کے آنسو جو شاید اس کے ہپوٹوں میں چھپے بیٹھے تے، فوراً پلکوں کی جڑوں میں جمع ہو گئے۔ "اے ڈاگدار صاب!" اس نے دوبارہ کہا اور آنکھیں یوں زور سے بیچ لیں جیسے ان میں سے آنسوؤں کو نچوڑ رہا ہے۔

میں اس قسم کی ہنگامی رقّت کا عادی ہو چکا ہوں۔ کسی کو روتا دیکھ کر، خصوصاً مرد کو، اور پھر اتنے تنومند اور وجیہہ مرد کو روتا دیکھ کر دُکھ ضرور ہوتا ہے مگر اب میں اس بیقراری کے مظاہرے کا اہل نہیں رہا جو ایسے موقعوں پر غیر ڈاکٹر لوگوں سے سرزد ہو جاتی ہے۔

"بارے سے آؤ خان!" میں نے نرمی سے کہا۔ "بنچ پہ بیٹھ جاؤ اور باری سے آؤ۔"

اب اس کے آنسوؤں نے اس کی مونچھوں اور ڈاڑھی تک کو بھگو دیا تھا۔ اس کی ناک سُرخ ہو گئی تھی اور گردن کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ "تم باری بولتا ہے ڈاگدار صاب اور اور ہمارا بیٹی مرتا ہے، ہمارا بیٹی کے پسلی میں دَرد ہے۔ اِدر بھی دَرد ہے اُدر بھی دَرد ہے۔ ہمارا بیٹی روتا ہے، ہمارا بیٹی کانستا ہے تو چیختا ہے۔ ہمارا بیٹی جوان ہے۔"

اس آخری فقرے پر میں چونکا۔ خان کی بیٹی کو نمونیہ ہو گیا ہے اور شاید ڈبل نمونیہ ہے۔ لیکن مجھے یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ اس کی بیٹی جوان بھی ہے۔ میں پٹھانوں کی عزّت کرتا ہوں، اس لئے کہ وہ غیور، بہادر اور سچے ہیں۔ مگر آخر اتنی شدید سچائی بھی کیا کہ بیٹی کے سن و سال تک کا اشتہار دے دیا جائے۔ مجھے افسوس ہوا کہ ادھیڑ عمر کے

اس تنومند وجیہہ پٹھان کی ذہنیت اتنی پست ہے کہ وہ مجھے اپنی بیٹی کی جوانی کا لالچ دیتا ہے اور میرے متعلق اسے یقین ہے کہ میں یہ اطلاع پاتے ہی ہتھیار ڈال دوں گا اور اس کی بیٹی کے پاس بھاگا جاؤں گا۔ "نہیں!" میں نے اپنی آواز میں ذرا سی گرج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ابھی ٹھہرو۔ باری سے آؤ۔"

میں نے ایک مریض کو قریب آنے کا اشارہ کیا مگر خان نے دو لمبے ڈگ بھرے اور اُٹھتے ہوئے مریض کو ایک ایسا ٹہوکا دیا کہ وہ پھر سے یوں بنچ پر بیٹھ گیا جیسے کبھی اٹھا ہی نہیں تھا۔ اب کے خان کی آواز میں غصہ بھی تھا۔ "ہم کہتا ہے ہمارا بیٹی مرتا ہے، تم کہتا ہے باری سے آؤ۔ اچھا منصف ڈاگدار ہے!" پھر وہ فریاد کرنے لگا۔ "ہم تم کو دعا دے گا، ہم تمہارا نوکری کرے گا۔ ہم تمہارا لکڑی چیرے گا۔ ہمارا بیٹی کو بچاؤ، ہمارا بیٹی جوان ہے۔"

میں ذرا سا متاثر ہونے لگا تھا کہ خان نے پھر اپنی بیٹی کی جوانی کا مژدہ سنایا۔ میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا مگر اس کے چہرے پر سوائے لوٹ کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑا گہرا دکھ تھا اور اس کے ہونٹوں کے گوشے ٹھوڑی کی طرف خم کھا کر اس کے چہرے کو مجسم پکار بنا رہے تھے۔ میں نے سٹیتھسکوپ اٹھائی اور دوسرے مریضوں سے معذرت کر کے خان سے کہا۔ "چلو خان، آؤ!"

خان مجھے دُعائیں دینے لگا۔ "سچا مسلمان ڈاگدار ہے۔ خُدا بڑا بڑا دولت دے، خُدا لمبا لمبا موٹر دے، خُدا اچھا اچھا بچہ دے۔ خُدا ــــــ"

سڑک پر جا کر میں نے خان سے پوچھا۔ "تانگا لے لیں؟"

خان بولا۔ "نہیں نہیں ڈاگدار صاب! ہم تمہارا ہمسایہ ہے۔ ہمارا تمہارے پر حق ہے۔ اور ایک منٹ میں جاتا ہے۔ خُدا تمہارا بلا کرے گا ڈاگدار صاب ہمارا بیٹی کو بچاؤ۔ ہمارا بیٹی جوان ہے۔"

مجھے خان کی اس مکرر یاد دہانی سے بڑی کوفت ہوئی مگر اب وہ میرے آگے لمبے لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن پر گرتے ہوتے پٹے سنہری تھے جن میں

کہیں کہیں کوئی سفید بال جھلک جاتا تھا۔ لمبے کرتے کے کالر پر تیل کی چکنائی اور میل کا ایک اور کالر چڑھ گیا تھا جو دھوپ میں چمک چمک جاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی موٹی انگلیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اور وہ کچھ یوں چل رہا تھا جیسے بس نہیں چل رہا ورنہ ایک ہی ڈگ میں گلی طے کر جاتا۔ میں اس کے پیچھے بھاگنے اور چلنے کے درمیان کی کسی کیفیت میں ہانپتا آ رہا تھا۔

"ادر کو ہے" وہ ایک اور گلی میں مڑ گیا اور پھر ایک گندی نالی پر سے پھاند کر رک گیا اور پلٹ کر بولا۔ "کود جائیگا ڈاگدار صاب؟"

میں فوراً کود آیا ورنہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں جواب دینے کے لئے رکتا تو وہ مجھے ایک بچے کی طرح بغل میں سمیٹ کر نالی کے اس پار لے جاتا۔ نالی پار کرتے ہی وہ پھر تیز تیز چلنے لگا اور آخر ایک کالی بھجنگ کوٹھڑی کے سامنے رکا۔ "یہ ہمارا ڈیرہ ہے۔ ہمارا بیٹی اندر ہے۔" پھر وہ اندر جاتے ہوتے پکارا۔ "گل رُخے!"

اندر گل رُخ نے کراہ کر کوئی بات کی مگر باپ بیٹی پشتو میں بول رہے تھے اس لئے میں بہت کم سمجھ پایا۔ یہ کوٹھڑی لکڑیوں کی ایک بہت بڑی ٹال کے احاطے میں تھی۔ اس قسم کی کوٹھڑیوں کی قطار دُور تک چلی گئی تھی۔ باہر چند پٹھان بچے کھیل رہے تھے۔ شام قریب تھی اس لئے تقریباً ہر کوٹھڑی کے دروازے میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ خان کی کوٹھڑی کے دروازے میں سے بھی اچانک گاڑھے دھوئیں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ میں دھوئیں سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹا تو خان باہر آیا اور بولا "اندر کیوں نہیں آتا ڈاگدار صاب، اندر آؤ نا" اور میں ناک پر رومال پھیلا کر اندر چلا گیا، بلکہ دھوئیں کے سیلاب میں اُتر گیا۔

خان نے محسوس کر لیا تھا کہ میں دھوئیں سے گھبرا رہا ہوں اس لئے اس نے دھواں چھوڑتی ہوئی لکڑیوں میں کچھ اس زور سے پھونکیں مارنا شروع کیں کہ معلوم ہوتا تھا دھونکنی چل رہی ہے۔ میں آگ کی سیدھ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا اور دم گھٹ رہا تھا۔ پھر ایک دم آگ بہت زور سے بھڑک اُٹھی اور کمرہ روشن ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے روشنی سے ڈر کر سارا دھواں دروازے کے پاس جا کر ڈھیر ہو گیا ہے۔ کوٹھڑی میں کوئی کھاٹ نہیں تھی۔ آگ کی پرلی طرف میلے کچیلے گودڑوں کی ایک ڈھیری سی

رکھی تھی اور خان اسی کے پاس کھڑا ہاتھ مل رہا تھا۔ "ادر کو ہے ڈاکدار صاب!" اس نے کہا اور پھر گودڑوں سے مخاطب ہوا "ڈاکدار صاب آ گیا گل رُخے! ڈاکدار صاب بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا اسلمان آدمی ہے۔ یہ تم کو ٹھیک کر دے گا۔ یہ تم کو انار کا دانہ بنا دے گا۔"

مجھے اب تک گل رُخ کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ مگر اس کی کراہوں کے رُک جانے سے میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ اُس نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے اور وُہ مادے حیا کے ضبط کئے بیٹھی ہے۔ دراصل اس کے چہرے کو شعلوں نے چھپا رکھا تھا کیونکہ جب میں خان کے قریب آیا تو گودڑوں میں حرکت ہوئی اور گل رُخ نے ٹانگیں پھیلا دیں۔ اس نے گردن تک لحاف اوڑھ رکھا تھا اور ماتھے پر سُرخ رنگ کے کپڑے کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ میں اس کے قریب زمین پر بیٹھ گیا اور بالکل ڈاکٹروں کے سے پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔ "سو یہ ہے گل رُخ!"

گل رُخ چھت کو دیکھتی رہی اور آنکھیں جھپکتی رہی۔ اس کے تیوروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے دَرد کی ٹیسوں پر بے پناہ ضبط کر رکھا ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور معلوم ہوتا تھا اُمڈے ہوتے آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے انہیں ابھی ابھی جلدی سے ملا گیا ہے، ان آنکھوں میں آگ کے شعلوں کا ننھا سا عکس ناچ رہا تھا۔ اتنی سیاہ آنکھوں میں آگ کی یہ چمک بالکل اس چراغ کی سی لگتی تھی جو گھپ اندھیری رات میں کہیں دُور ٹمٹما رہا ہو۔ اور ان آنکھوں کے اِرد گرد لمبی لمبی خمیدہ پلکوں نے کچھ ایسی گھنی قطار باندھ رکھی تھی، اور ان آنکھوں کی پہرہ داری کے منصب پر یہ کچھ ایسی مغرور معلوم ہو رہی تھیں کہ گل رُخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے پہلے ذرا سا سوچنا پڑتا تھا۔ بھویں اتنی لمبی تھیں کہ اس کی مینڈھیوں میں گم ہوتی جا رہی تھیں۔ سونے کے سے رنگ پر ان کی سیاہی یوں اُبھر آئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا بنا دی گئی ہیں اور آنکھوں کے تناسب کے مطابق کتر کر چپکا دی گئی ہیں۔ اس کی ناک کی اٹھان میں ایک تدریجی اٹھان تھی اور نتھنوں کے ذرا سے اُبھار میں جذبات سمٹے بیٹھے تھے۔ درد پر ضبط کرنے کے باعث اس کے نتھنے پھڑک پھڑک جاتے تھے اور چہرے کا سونا چمک اُٹھتا تھا۔ مصنوعی حد تک گلابی ہونٹ نیم وا تھے۔ اس لئے

ان کے بیرونی خطوط بہت واضح ہو رہے تھے۔ اُوپر کا ہونٹ اس کمان کا سا تھا، جسے قدیم یونانی سنگ تراش کیوپڈ کے ہاتھ میں دکھاتے تھے اور نچلا ہونٹ ایک قوس سی معلوم ہو رہا تھا۔ صرف وسط میں آ کر وہ بہت خفیف سا خم کھا گیا تھا۔ دونوں ہونٹوں کے گوشے کہاں ملتے تھے، اس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ دونوں قوسیں دونوں طرف کہیں گہرائیوں میں چلی گئی تھیں اور ایک گوشے کے کنارے کا تل جیسے اس گہرائی میں مستقل جھانک رہا تھا۔ نیم وا ہونٹوں کے درمیان ذرا ذرا دکھائی دیتے ہوئے بہت سفید دانتوں میں بھی آگ کے شعلے ناچ رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی کو گودڑ کے ایک حصّے نے چھپا لیا تھا اور کانوں کو ایک میلی سُرخ چادر نے جس کے کنارے کے ساتھ ساتھ اس کی کنپٹیوں سے اُوپر کی باریک باریک گندھی ہوئی مینڈھیوں کا ایک حصّہ نظر آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے ایک نظر میں اور ایک پل میں دیکھ لیا اور بعد میں جب میں نے سوچا کہ آخر میں نے ایک ہی پل میں اس کے چہرے کی ایک ایک تفصیل کو کس طرح اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا، آخر مجھے اس کی کنپٹیوں کے نیچے والے سنہری روئیں کیسے دکھائی دے گئے اور اس کے ایک گال پر کا وہ سوئی کی نوک کا سا سُرخ نشان کیسے یاد رہ گیا جو شاید مچھر کے کاٹنے سے پیدا ہوا تھا۔ بہر حال میں نے گل رُخ کو ایک نظر دیکھا اور پھر خان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہوں "تم ٹھیک کہتے تھے خان! تمہاری بیٹی صحیح معنوں میں جوان ہے۔"

خان مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر میرے پاس بیٹھ گیا اور پھر رقّت بھرے انداز میں بولا "ہم کیا کرے ڈاگدار صاب! ہم مرد ہو کر روتا ہے، ہم کو بڑا شرم لگتا ہے پر ہمارا بیٹی ہمارا خزانہ ہے —— یہ مر گیا تو ہم مر جائے گا۔ اس کو کوئی ایسا دوائی دو کہ بس یوں ——" اور اس نے ایک نہایت زور دار چٹکی بجائی —— "یوں درد چلا جائے۔ ہم تمہارا نوکری کرے گا۔ ہم تمہارا بچّوں کو دُعا دے گا۔"

میں نے خان کے ایک کندھے کو تھپکا اور پھر دوسری نظر گل رُخ پر ڈالی مگر میری آنکھیں فوراً جھپک گئیں، وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور ان آنکھوں میں کتنی وسعت اور کتنی گہرائی تھی۔ میرا ذہن اتنے مکمل حسن کو گرفت میں لانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا

تھا۔ سو اسے اس بے کار کی ریاضت سے بچانے کے لئے میں نے گل رُخ سے پوچھا۔ کس قسم کا دَرد ہے گل رُخ؟ ایک جگہ پر کچو کا سا محسوس ہوتا ہے یا یہ دَرد کافی حصّے پر پھیلا ہوّا ہے؟"

خان کی آواز ایک دم کرخت ہوگئی۔" اُدر کیا پُوچھتا ہے، اِدر ہم سے پُوچھنا!"

مَیں نے ناگواری سے کہا۔"تم مجھے یہاں اس لئے لاتے ہو کہ میں مریضہ کو دیکھوں؟"

"دیک تو لیا۔" اس نے کہا۔"اب دوسرا باتیں ہم سے پُوچھو!"

میں خود تو پریشان ہو ہی رہا تھا، انتقاماً میں نے اسے بھی پریشان کرنا چاہا۔"میں گل رُخ کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔"نبض نہیں دیکے گا۔ تم غیر محرم ہے۔ ہم زنانہ لوگ کا نبض نہیں دکاتا ہے۔ ہم پٹھان ہے۔"

میں غصّے سے اُٹھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا باہر آگیا۔ خان میرے پیچھے بھاگا اور اندر سے گل رُخ کی لمبی لمبی کراہوں کی آواز آنے لگی۔

"کدر کو جاتا ہے ڈاگدار صاب؟" خان کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔" ناراضی مت کرو نا۔ اِدر ہمارے وطن میں لڑکی کا نبض نہیں دکاتا ہے۔ ہم تم کو بتاتا ہے گل رُخ کے اِدر کو بھی درد ہے۔ اُدھر کو بھی درد ہے۔ بڑا کافر بخار ہے۔ زبان سُوک سُوک جاتا ہے۔ کانستا ہے تو چیختا ہے۔ رات کو کانستا تو بے ہوشی ہو گیا۔ دیکو ڈاگدار صاب! ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ ہمارا بیٹی جوان ہے۔"

میں نے تنگ آکر کہا۔"خان! دیکھو، ڈاکٹر اگر مریض کی نبض نہ دیکھے، یہ آلہ لگا کر درد والی جگہ نہ دیکھے۔ اس کی زبان نہ دیکھے، اس کے ناخنوں کا رنگ نہ دیکھے اور خود مریض سے اس کی بیماری کا حال نہ سنے تو وہ علاج خاک کرے گا۔ اگر یہ ساری باتیں تمہی کو بتانی تھیں تو پھر مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"او ہو ڈاگدار صاب!" خان ان الفاظ کو کچھ یوں کھینچ کر بولا جیسے اسے میری سادگی پر

رحم آگیا ہے۔" ہم تم کو یہ دکانے لایا کہ ہمارا بیٹی جوان ہے!"

میں چکرا کر رہ گیا۔ میرے دل میں اُبال سا اُٹھا کہ خان سے اس تکرار کی وجہ پوچھوں اور اسے یہ بھی بتا دوں کہ اس کی بیٹی واقعی جوان ہے اور ناقابلِ یقین حد تک حسین بھی ہے اور وہ ان میلے چکیٹ گودڑوں میں لپٹی ہوئی یوں نظر آتی ہے جیسے گھورے پر گلاب کا پھول پڑا ہو۔ لیکن آخر ان سب باتوں سے مجھے کیا لینا ہے!

خان نے مجھے حیران دیکھ کر پوچھا "سمجھا؟"

"سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔

اور خان کو میں نے پہلی بار مسکراتے دیکھا۔ لیکن گل رُخ کی کراہوں کی آواز سُن کر اُس کی مسکراہٹ مرجھا گئی اور وہ لپک کر دروازے تک گیا۔ پشتو میں اس نے گل رُخ سے کچھ کہا اور میرے پاس آکر گل رُخ کے درد، بخار اور بیقراری کا سارا قصہ دوبارہ کہہ سنایا۔ میں نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ پنسلین کے چند انجکشنوں سے گل رُخ تندرست ہو جائے گی۔

"سوئی لگے گا؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھ سے پوچھا۔ "نہیں ڈاگدار صاب! سوئی نہیں لگاؤ۔ گولی دو۔ شربت دو۔" ——— سوئی بڑا کافر چیز ہے۔ سوئی تو ہم بھی نہیں لگوائے گا۔ گل رُخ کیسے لگوائے گا؟"

اب یہ نئی مشکل پیدا ہو گئی تھی اور اِدھر شام ہونے کو آئی تھی اور مطب میں مریضوں کا ایک ہجوم میرا منتظر تھا۔ میں نے خان کو یقین دلانے کے لئے خلافِ عادت قسمیں کھائیں کہ گل رُخ صرف اسی طرح تندرست ہو سکتی ہے۔ پھر اسے چند واقعات سنائے کہ کس طرح نمونیہ کے وہ مریض جو یہ انجکشن نہ لگوا سکے، مر گئے۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے سلسلے میں محرم اور غیر محرم کی قید اڑا دینی چاہیئے "اور اگر تم یہ سب باتیں نہیں مانتے" میں نے اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی "تو پھر اپنی گل رُخ کے کفن اور قبر کا ابھی سے انتظام کر لو۔ اس حالت میں تو شاید وہ آدھی رات تک بھی مشکل ہی سے چل سکے۔"

خان نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر یوں ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کہ باوجود ڈاکٹر ہونے کے مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے فوراً بیگ کھولا۔ دوا تیار کر کے سرنج میں

بھری اور دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر خان اسی طرح روتا ہوا راستہ روک کر دروازے میں کھڑا ہوگیا اور آہستہ سے بولا "سوئی کو چُھپا لو ڈاکدار صاب! گل رُخے دیکھے گا تو روئے گا۔"

میں نے سرنج چھپا لی تو وہ بولا "ہم کو بتا دو ہم لگا دے گا۔"

میں نے اسے پھر سمجھانا شروع کیا کہ کوئی دوسرا آدمی یہ کام کرے گا تو سوئی کے ٹوٹنے اور غلط انجکشن لگنے سے مریض کے مرجانے تک کا خطرہ ہوتا ہے۔

وہ دروازے میں سے بادلِ ناخواستہ ہٹ گیا اور بڑے پیار سے بیٹی کو پکارا "گل رُخے"

گل رُخ کی کراہیں ایک دم رک گئیں۔

خان بولا "ڈاکدار صاب تم کو ایک دوائی دے گا۔ دوائی ذرا سا کاٹتا ہے پر یہ انشاء اللہ بیماری کو بھی کاٹتا ہے۔ میرا بیٹی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم اپنا بیٹی کے لئے ریشم کا شلوار لائے گا۔ شیشے والی چوڑی لائے گا۔ جلیبی کھلائے گا۔" پھر اُس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

گل رُخ نے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی تھی اور اس کی موٹی سی چوٹی فرش پر بچھے ہوئے گودڑ پر ناگن کی طرح لہرائی ہوئی پڑی تھی۔ خان نے ایک لمبا ڈگ بھرا اور چوٹی کو گودڑ میں کچھ اس تیزی سے چھپا دیا جیسے اس چوٹی کی وجہ سے ساری گل رُخ ننگی ہو رہی ہے۔ پھر اس نے ہونٹوں سے پچ پچ کی آواز نکالتے ہوئے گل رُخ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری طرف دیکھا۔

"بازو پر سے کپڑا ہٹا دو" میں نے کہا "یہاں سے۔"

خان کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر کچھ اس انداز سے جیسے وہ بالکل بے بس کر دیا گیا ہے۔ اس نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکا اور گل رُخ کی کھلی آستین اُوپر چڑھا دی مگر فوراً اس کے سارے بازو پر گودڑ پھیلا دیا۔ صرف وہی ذرا سا حصّہ ننگا رکھا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ اس کو بیٹی کے معاملے میں اس حد تک محتاط دیکھ کر میں نے اس کا دل رکھنے

کے لئے کہا "دیکھو خان! میں گل رُخ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ تم اس کا بازو اچھی طرح تھامے رکھو۔ گل رُخ کو سمجھا دو کہ وہ بازو نہ ہلائے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

خان نے پشتو میں گل رُخ کو سمجھایا اور میری طرف بڑے دردمندانہ انداز میں دیکھا۔ مجھے بازو کی طرف جھکتا دیکھ کر اس نے گل رُخ سے کہا "دوا کاٹے گا گل رُخے خبردار!"

میں نے تیزی سے سوئی کو گل رُخ کے بازو کے سونے میں اتار دیا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی مگر اُف تک نہ کی۔ خان نے اپنے نچلے ہونٹ کو بڑے زور سے دانتوں میں دبا لیا۔ میں نے جلدی سے دوا گزار دی اور پھر خان کو سوئی کے پاس انگلی سے دباؤ ڈالنے کو کہا اور سوئی کھینچ لی۔ روئی کا ذرا سا ٹکڑا دے کر میں نے اسے ہدایت کی کہ انجکشن کی جگہ کو ذرا سا مل دے۔ میں واپس چلا تو خان بولا "اب پر کب لگے گا ڈاگدار صاب ——؟"

"کل صبح کو" میں نے کہا "تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود آجاؤں گا۔"

خان نے دعاؤں کا تانتا باندھ دیا اور دروازے پر سے ایک بڑا زوردار "السلام علیکم" کہہ کر اندر چلا گیا۔

میں نے مسلسل تین روز گل رُخ کو پنسلین کے باقاعدہ انجکشن دیئے اور وہ صحت یاب ہو گئی۔ میرے جاتے ہی وہ خود ہی آستین چڑھا لیتی، مسکراتی۔ انجکشن لے کر آستین گراتی اور کروٹ بدل لیتی اور خان باہر آکر مجھے ہزار ہزار دعائیں دیتا اور کہتا "خدا نے بچایا، ڈاگدار صاب نے بچایا۔ بڑا مہربانی کیا۔ ہمارا بیٹی جوان تانا۔ مرجاتا تو ہم بھی مرجاتا۔"

انجکشن کے آخری روز میں نے خان کو کھانسی کی چند گولیاں دیں اور کہا کہ وہ دو روز کے بعد مطب میں آکر مجھے گل رُخ کی کیفیت بتا جائے۔ اگر اس کی کھانسی ان گولیوں سے نہ رُکی تو دوا بدل دی جائے گی۔ اس روز میں نے خان سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں انجکشنوں اور دواؤں کی قیمت نہیں لوں گا۔

"وہ تو ہم کو پہلے خبر تا" وہ فوراً بولا "تمہارا شرافت تمہارا ماتے میں چمکتا ہے۔"

اس روز میں نے گل رُخ سے بھی ایک بات کرنے کی جرأت کر لی۔ "اچھا بھئی گل رُخ!" میں نے کہا "خدا نے تمہیں صحت بخشی۔ اب چند روز آرام کرنا۔ اچھا ——!"

گل رُخ دیوار سے لگ کر بیٹھی تھی۔ میری یہ بات سُن کر اس کا چہرہ اچانک گلابی ہوگیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ مسکرا دی۔ نہایت دھیمی آواز میں بولی "خُدا تم کو خوش رکھے۔"

دو روز کے بعد شام کو جب میں مطب کو بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا تو خان اندر آیا اور بڑے تپاک سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا "کالسی بی چلا گیا ڈاگدار صاب۔ گل رُخے چلتا پرتا ہے۔ اچا سوتا ہے۔ بڑا خوش ہے۔"

مَیں نے کہا "خُدا کا شکر ہے!"

خان بولا "تم نے بڑا مہرابانی کیا ڈاگدار صاب! تم نے ہم کو خرید لیا۔ ہمارا بیٹی کو اچا کر دیا۔ ہمارا بیٹی مرتا تو ہم بھی مرتا ——— ہمارا بیٹی جوان ہے۔"

آج میں ضبط نہ کر سکا۔ فوراً پوچھا "خان! یہ بتاؤ، آخر تم بار بار مجھے یہ کیوں بتاتے ہو کہ تمہاری بیٹی جوان ہے؟"

"اوہو ڈاگدار صاب!" خان ان الفاظ کو کچھ یوں کھینچ کر بولا جیسے اسے میری سادگی پر رحم آ گیا ہے۔ "تم نہیں جانتا۔ تم تو بالکل بچہ ہے۔ تم نے ہمارا گل رُخے کو بچایا۔ تم نے ہمارا ایک ہزار روپیہ بچایا۔"

"میں یہ بھی نہیں سمجھا۔" مَیں نے چکرا کر کہا۔

"دیکو" خان مُسکرا کر بولا "ہمارا بیٹی بڑا اچا جوان ہے نا۔ ہم کو گل رُخے کی شادی کا پانچ سو ملتا ہے۔ ہم ایک ہزار سے کم نہیں لے گا۔ تم نے ہمارا ایک ہزار روپیہ بچایا۔ تم بڑا سچا مسلمان ہے ڈاگدار صاب!"

(تجربہ و مشاہدہ حضرت رضا ہمدانی کا ہے جسے مُصنّف افسانوی صورت دینے کا ذمہ دار ہے)

خونِ جگر

پیارے شہاب،

تم نے میری خاموشی کو پراسرار کہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر خاموشی پُراسرار ہو، لیکن میری خاموشی یقیناً پراسرار تھی اور یہ اسرار اتنے لطیف ثابت ہوئے کہ پھول کی خُوشبو کی طرح فضا میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں، اور میں ان کے تعاقب میں بیکار مارا مارا پھر رہا ہوں، خوشبو کا تعاقب ہمیشہ بیکار ہی ہوتا ہے نا،

میں تمہارے ساتھ مری محض اس لئے نہیں آیا تھا کہ ان دنوں میرے آس پاس چند لطیف راگ اُگ رہے تھے، میں نے تمہیں مری نہ آسکنے کی صحیح وجہ اس لئے نہیں بتائی تھی کہ یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور مجھے ڈر تھا کہ تم میرا مذاق اڑاؤ گے، ویسے تم نے میرا ہزار بار مذاق اڑایا ہے لیکن میں اپنی اولین محبت کا مذاق اڑتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور نیا نیا جذبہ میرے دل میں اتنا تقدس اختیار کر چکا تھا کہ تم میرا مذاق اڑاتے تو میں یوں سمجھتا کہ تم نے ایک پجاری کے سامنے اس کے دیوتا کے بت پر ضرب لگائی ہے۔

میں تمہیں رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن پر بھی نہ آسکا، تمہاری گاڑی ٹھیک اس وقت چھوٹتی تھی جب حنیف کے ہاں دعوت کو شروع ہونا تھا۔ اور خفا نہ ہونا ان دنوں تمہاری گاڑی سے حنیف کی دعوت زیادہ اہم تھی۔

اس روز شیرازہ کو حنیف کے ہاں سے رخصت ہونا تھا۔ شیرازہ حنیف کی کوئی دُور کی عزیزہ تھی۔ لیکن حنیف کی امی اس سے کچھ یوں ٹوٹ کر پیار کرتی تھیں جیسے شیرازہ

ان کی بیٹی ہے اور بیاہ کر پردیس چلی گئی ہے، ویسے شیرازہ کا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان دے کر وہ ان دنوں "ہالیڈے موڈ" میں تھی اور مختلف عزیزوں کے ہاں ہفتہ ہفتہ بھر رُک کر انہیں ممنون اور اپنے آپ کو مسرور کرتی پھرتی تھی۔

بس ہفتہ بھر پہلے اس سے میری ملاقات ہوئی تھی، میں شام کو حسب معمول حنیف کے ہاں گیا تاکہ کہیں جا کر بلیرڈ کھیلیں یا سینما دیکھیں یا میر کی غزلیں اور میرا بائی کے بھجن گائیں۔ تمہارے پاس تو میں صرف اس وقت آتا تھا جب مجھے یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ دُنیا فانی ہے، انسان اکیلا ہے اور قدرت سفاک ہے، تمہارے خلوص نے مجھے ہمیشہ سہارا دیا ہے، تم نے مجھے جب "پیارے" "تم تو پاگل ہو ملے" کہا ہے تب مجھے ایسا لگا ہے جیسے میں ایک گاتے اور ناچتے ہوئے زندہ کارواں میں شامل ہوں۔ اور یہ سارا کارواں میرا نگراں اور محافظ ہے۔ اور تم جانتے ہو قنوطیت کے یہ موڈ مجھ پر ہفتے میں یہی کوئی دو بار ہی طاری ہوتے ہیں۔

میں جب بھی شام کو حنیف کے ہاں گیا ہوں وہ مجھے اپنی کوٹھی کے لان میں کچھ اس حالت میں دکھائی دیا ہے کہ بید کے مونڈھے پر بیٹھا ہے، سامنے تپائی پر ٹانگیں پھیلا رکھی ہیں، ایک ہاتھ میں سگریٹ ہے، دوسرے میں اشعار کی کوئی کتاب ہے، اور اس کا ننھا سا مٹھی بھر کا سفید کتا تپائی کے نیچے بیٹھا اس کے سلیپروں سے کھیل رہا ہے۔ لیکن اس روز لان میں کرسیوں کا ایک دائرہ تھا جس پر حنیف کی امّی، بہن اور تینوں چھوٹے بھائی بیٹھے تھے اور حنیف بادامی رنگ کی بشرٹ اور سفید رنگ کی پتلون پہنے اپنے بید کے مونڈھے پر بیٹھا ایک لامتناہی قہقہے میں گم تھا۔ حنیف ہنستا ہے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں اور وہ زور سے ہنسے تو آنکھوں کا پانی اس کا سارا چہرہ بھگو ڈالتا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور میری طرف لپکا مگر مجھ تک آتے آتے غیر مختتم قہقہوں نے پھر سے اس کے سُرخ چہرے کو بھگو ڈالا تھا۔ "اس قدر بے تحاشا کیوں ہنسے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ میرا ہاتھ کھینچتا ہوا کرسیوں کی طرف بڑھا اور ہنسی پر ضبط کی کوشش کرتے ہوئے بولا "میں نے حاضرین کو ایک لطیفہ سنایا تھا۔ مگر لطیفہ ناکام رہا۔ مجھے حاضرین کی

بے اختیار ہنسی کا انتظار تھا مگر حاضرین کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور یوں میرے لطیفے کی ناکامی خود ایک لطیفہ بن گئی۔" سب پھر سے ہنسنے لگے۔ حنیف کے سب سے چھوٹے بھائی نے میرے لئے کرسی خالی کر دی مگر میں ابھی بیٹھنے نہیں پایا تھا کہ حنیف نے اپنی امّی کے پہلو کی کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے میرا تعارف کرایا "یہ شیرازہ ہیں، آپ اب کے ایم۔اے فلسفہ کے امتحان میں بیٹھی ہیں۔ رشتے کے مختلف اعداد و شمار سے سراغ چلتا ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح امی جان کی بہن ہوتی ہیں، اس لئے میری خالہ ہوئیں۔"

پھر سے ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ شیرازہ کے قہقہے سب سے بلند تھے اور وہ ان قہقہوں کے درمیان کہہ رہی تھیں "ہائے مجھے کیا پتہ تھا کہ میں کسی کی خالہ بھی ہوں۔ ہائے کیسا عجیب سا لگتا ہے، مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک دم دُنیا کے سارے دانت گر پڑے ہیں!"

"اور آپ ہیں میرے بڑے ہی پیارے دوست عبدالمالک" حنیف نے میرا تعارف کرایا "آپ کو اپنے نام میں موسیقی کی کمی کا گلہ ہے اس لئے عنقریب اخباروں میں اپنے نام کی تبدیلی کا اعلان کرنے والے ہیں، میں نے ان کے لئے معتصم باللہ کا نام تجویز کیا ہے۔ حاضرین کی کیا رائے ہے؟"

پھر سے قہقہوں کا دَور چلا اور جب یہ قہقہے رُکنے کو آئے تو شیرازہ بولی "ایک تو اصلی نام ہوتا ہے نا۔ اور ایک پیار کا نام۔ تم انہیں پیار سے کیا کہہ کر پکارو گے؟"

"باللہ کہہ کر!" حنیف بولا۔ اور اب کے قہقہوں نے سب کو کرسیوں میں جیسے مروڑ ڈالا۔ اور حنیف کی امی پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دباتے اٹھیں اور قہقہوں پر ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں "اوّل درجے کا شریر لڑکا ہے یہ۔ میرے تو پھیپھڑے پھٹنے کو آ گئے۔" اور وہ چلی گئیں۔ ان کے پیچھے حنیف کے تینوں چھوٹے بھائی بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف شیرازہ، حنیف کی بہن عصارہ، حنیف اور میں وہاں بیٹھے ٹوٹتے ہوئے قہقہوں پر قابو پاتے رہ گئے۔

میں نے حنیف سے بلیرڈ اور سینما کا ذکر کیا تو وہ بولا "یار دیکھتے نہیں۔ شیرازہ آئی ہوئی

ہے، اب جب تک یہ ہمارے ہاں سے نہیں جاتی، ہمیں اپنے سب پروگرام ملتوی کرنے پڑیں گے۔"

شیرازہ فوراً بولی "ہائے اگر میں ایسی ہی تمہاری صاف راہ کا روڑا ثابت ہوتی ہوں تو بس آج ہی باجی سے رخصت لے لوں گی۔" لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے یہ بات خفا ہو کر نہیں، محض چھیڑنے کے لئے کہی ہے۔

حنیف کو بھی جیسے پہلے سے معلوم تھا کہ شیرازہ خفا ہونا جانتی ہی نہیں، بولا "نہیں نہیں بھئی شیرازہ۔ یوں ایک دم چٹاک پٹاک نہیں ہو جاتے کہ اچھی خاصی پڑھی لکھی سوجھ بوجھ والی لڑکی بھاڑ کا دانہ معلوم ہونے لگے۔ بات یہ ہے مالک کہ میں بچپن میں شیرازہ کے ساتھ مدتوں کھیلا ہوں، میں مریل سا بچہ تھا اور یہ شیرازہ ٹھن منتھنی، بھاگتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کا گوشت اس کے جسم سے الگ ہو کر یوں دھب سے گر پڑے گا جیسے دیوار پر سے کچا گارا اچٹ کر گرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے جی بھر کر پیٹا ہے، مجھے اب تک اس کے ایسے ایسے تھپڑ یاد ہیں جب میرے کان میں سیٹیاں بجنے لگیں اور میری ایک آنکھ میں تارے، تتلیاں اور خون کے دھبے اور جانے کیا کیا ناچنے لگے، اس کے بعد بھی شیرازہ سے ملاقاتیں ہوئی ہیں مگر بزرگوں کی موجودگی میں جہاں ہر کسی کو دم سادھ کر بیٹھنا پڑتا ہے، آج مدت مدید عرصہ بعید کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے ہاں ان حالات میں وارد کیا ہے کہ ابا جان ایک سال کے لئے فرانس گئے ہوئے ہیں، امی گوشہ نشین ہیں اور یہ سامنے جو عصارہ بیٹھی ہے نا۔ اس کے منہ میں ماشاء اللہ زبان ہی نہیں۔ سو اب میرے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور مجھے بشارت ہوئی ہے کہ بچپن کی مار پیٹ کا بدلہ لینے کا یہ مناسب ترین موقع ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مریل بچہ بڑا ہو کر یہ پہلوان بنا بیٹھا ہے اور وہ ٹھن منتھنی لڑکی وہ پتلی دبلی کالج اسٹوڈنٹ بنی بیٹھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت بھی میری پشت پناہی کر رہی ہے۔ ان حالات میں مجھے بلیرڈ اور سینما کا لالچ نہ دو، میں ان دنوں بہت مصروف ہوں۔"

شیرازہ اور عصارہ منہ پر ہاتھ رکھے خوب خوب ہنسے جا رہی تھیں، میں مسلسل مسکرا

رہا تھا مگر حنیف نے یہ ساری تقریر بڑی سنجیدگی سے کی۔ تقریر ختم کرنے کے بعد وہ بھی مسکرانے لگا اور اپنی بہن کی طرف دیکھنے لگا۔ "کھل کر ہنسو عصارہ۔ تم یوں جھینپ جھینپ کر کیوں ہنستی ہو بچگی۔ منہ میں زبان نہیں تو کیا حلق بھی نہیں کہ پھیپھڑوں کے طوفان کو اگل ڈالو"

عصارہ ہنسی پر ضبط کرنے کی کوشش میں لال بھبھوکا چہرہ لئے اٹھی اور کوٹھی کی طرف بھاگ گئی اور وہاں برآمدے میں پڑی ایک کرسی پر گر کر دیر تک ہنستی اور کرسی کے اندر بل کھاتی رہی، پھر وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

ہم تینوں دیر تک باہر لان میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور آخر ایک وقفے کی خاموشی کے بعد شیرازہ بولی۔ "اور سناؤ حنیف، کیا حال ہے؟"

حنیف میری طرف دیکھ کر بولا۔ "جب باتیں کرتے کرتے شیرازہ حال پوچھنے لگتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "اچھا! اب چلیے۔ خدا حافظ۔"

حنیف نے یہ بات مذاق میں کہی تھی مگر مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میری ہتک ہو گئی۔ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "اچھا تو خدا حافظ!"

شیرازہ اور حنیف میری اس حرکت پر دم بخود رہ گئے۔ پھر حنیف بولا۔ "شاید تمہاری حس لطیف ختم ہو رہی ہے مالک۔"

اچانک مجھے اپنی بھونڈی حرکت کا احساس ہوا اور میں نے کہا۔ "نہیں نہیں حنیف، مجھے واقعی ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔"

اور میں نے تمہارا نام لے کر ایک خیالی تقریب کا ذکر کیا اور اسے بتایا کہ مجھے بلیرڈ اور سینما کا پروگرام بناتے ہوتے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے شہاب کے ہاں جانا ہے۔

حنیف نے مجھے اجازت دے دی مگر شیرازہ بولی۔ "دیکھئے مالک صاحب، اگر آپ کے دوست شہاب صاحب بھی وہ تقریب منعقد کرنا بھول گئے ہوں تو پھر سیدھے ادھر آنے کی کوشش کیجئے گا، ذرا گپ رہے گی اور پھر میں آپ کو وائلن سناؤں گی۔ حنیف سے تو یہ پروگرام پہلے سے طے ہے۔"

"ہاں ہاں بھئی" حنیف بولا۔ "روایت ہے کہ شیرازہ وائلن بہت اچھی بجاتی

ہے۔ کوشش کرنا۔"

"بہت اچھا" میں نے کہا۔ اور اپنی مرضی کے خلاف چلا آیا۔ لیکن مجھے حنیف پر بہت غصہ آرہا تھا۔ آخر اس نے مجھے وائلن کے پروگرام کی پہلے سے اطلاع کیوں نہیں دی تھی، مجھے تو وہ یہ تک بتا دیتا تھا کہ عصارہ اس کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی تو سوئی ٹوٹ گئی، اور آج امی ابا کی یاد میں جائے نماز پر بیٹھی روتی رہیں، وائلن کی بات کو راز رکھنا حنیف کو تو قطعی نہیں جچتا تھا۔ اور پھر مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا کہ اتنے زود حس ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ شیرازہ کے اس سوال پر کہ اور سنائیے کیا حال ہے۔ آسانی سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ آپ ہی سنائیے، کیا حال ہے؟ ذرا قہقہہ پڑتا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔ پھر شیرازہ کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے میری بات کے جھوٹا ہونے کا یقین ہے اور وہ جانتی ہے کہ شہاب کے ہاں کوئی تقریب نہیں، میں نے محض بہانہ کیا ہے۔

لیکن شہاب، تم بھی حیران ہو گئے۔ اور اس وقت میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر میں ایک دم اتنا ذکی الحس کیوں ہو گیا تھا۔ اب میری وہ حیرت ختم ہو چکی ہے، اس روز بھی تھوڑی ہی دیر بعد میری حیرت ختم ہو گئی تھی، اور جب میں نے اپنے اس بھونڈے طرز عمل کے بارے میں بار بار سوچا تھا تو بار بار ہنستی، مسکراتی، سنجیدگی سے باتیں سنتی اور بڑی خود اعتمادی سے باتیں کرتی ہوئی شیرازہ میرے سامنے سے یوں گزر جاتی تھی جیسے وہ نمائش کے چکر لاتے ہوئے جھولے میں بیٹھی پل پل بھر بعد آتی ہے اور چلی جاتی ہے، آتی ہے اور چلی جاتی ہے،

تمہیں یہ یقین دلانے کے لئے میرا قسموں پر قسمیں کھانے کو جی چاہ رہا ہے کہ شیرازہ دُنیا کی حسین ترین لڑکی ہے، اس کے چہرے کے تمام نقوش کم از کم ایشیا کے معیار حسن پر صد فی صد پورے اترتے ہیں، سوائے آنکھوں کے، جنہیں ہرن کی سی آنکھیں نہیں کہا جاسکتا، اور خُدا کا شکر ہے کہ اس کی آنکھیں اتنی بڑی بڑی اور سیاہ نہیں ہیں ورنہ وہ ساری کی ساری مصنوعی معلوم ہونے لگتی۔ یہ آنکھیں لمبی لمبی ضرور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان پر پلکوں کی قطاریں بھی لمبی ہیں اور اسی مناسبت سے اس کی بھویں بھی پتلی لمبی اور

خمیدہ ہو گئی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے یہ آنکھیں ذرا سی اور لمبی ہوتیں تو کنپٹیوں کے کہیں
آس پاس ہی ختم ہو پاتیں۔ ان کا رنگ گہرا بادامی ہے اور جب وہ ہنستی ہے تو ہلکا
بادامی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کا رنگ اتنا گورا نہیں کہ آنکھیں چندھیا جائیں یا چہرے
کے نقوش اُبھر نہ سکیں۔ وہ ہنستی ہے تو اس کے دائیں گال میں ایک ننھے سے بُلبلے
کا سا ڈمپل اور بائیں گال پہ ہلال کی سی قوس ابھر آتی ہے اور مسکراتی ہے تو اس کے ہونٹوں
کے گوشوں میں بے شمار ذرا ذرا سے ڈمپل بنتے بگڑتے رہتے ہیں اور یوں اس کی مسکراہٹ
جاندار معلوم ہونے لگتی ہے۔ جیسے وہ گوشوں کی طرف سے اس کے ہونٹوں کی طرف
سفر کر رہی ہے۔ نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے درمیان کا خم اور پھر ٹھوڑی سے مڑ کر
گردن کی طرف جاتا ہوا خط —— ان میں مسجدوں کی محرابوں اور گنبدوں کا سا تقدس ہے،
ہاتھوں کی انگلیاں پتلی ہیں مگر پوروں تک جاتے جاتے باریک نہیں ہو جاتیں۔ باریک ہو
جاتیں تو مجھے بڑا صدمہ ہوتا۔ اس لئے کہ ایسی انگلیاں انگلیوں کے بجائے جنگ کے ہتھیار
معلوم ہونے لگتی ہیں۔ تم یہ سُن کر خوش ہو گے کہ وہ ناخنوں پر پالش بھی نہیں لگاتی شاید اسے
اپنے ناخنوں کے شربتی رنگ کا احساس ہے، اس کا قد کوئی پانچ فٹ چار انچ ہو گا۔ یا
شاید پانچ انچ ہو، یا شاید —— مگر نہیں پانچ فٹ پانچ ہی انچ ہو گا۔ اس لئے کہ اگر
میں اس سے لگ کر کھڑا ہو جاؤں تو میری ٹھوڑی اس کے ماتھے کو چھونے لگے گی۔ اور
میرا قد پانچ فٹ نو انچ ہے —— کہیں میرے ان اعداد و شمار سے تم تھک تو نہیں
گئے۔ یا ہنس تو نہیں رہے ہو دیکھو شہاب۔ تمہاری بات اور ہے تم نے انجینئرنگ پڑھی،
تم انگلستان بھی گئے تو وہاں بھی کارخانوں ہی میں گھومتے رہے، میں نے تم سے شیکسپیئر کی
جائے پیدائش، سٹیفورڈ آن ایوان کے بارے میں پوچھا تھا تو تم نے کہا تھا "ایک
روز شاید تمہاری خاطر شیکسپیئر کے پاس چلا جاتا۔ لیکن اس روز مجھے سڑک بنانے والا ایک
نئی قسم کا انجن دیکھنے کے لئے ویلز میں جانا تھا اس لئے ——" پھر تم وطن واپس آئے
تو تمہارے لئے دُلہن تیار بیٹھی تھی، تمہاری بیوی سے تمہارا تعارف شادی کی پہلی رات
ہی کو ہوا اگر تم دونوں یوں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے جیسے اب تک دونوں ایک دوسرے کی

تلاش میں جی رہے تھے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب ایک روز میں نے تمہیں مرزا سودا کا یہ شعر سنایا تھا کہ ؎

عشق سے تو نہیں ہُوں میں واقف
دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

تو تم نے کہا تھا "یہ شعر ہمارے مشرق کی ازلی ایذا پسندی کا خاصا بولتا ہوا ثبوت ہے!"
——— اور میں نے تمہیں لالہ رام نرائن کی کہانی سنائی تھی۔ جنہوں نے پچاس برس کی عمر میں بیس برس کی لڑکی سے شادی کر لی اور جب ایک چاندنی رات کو میاں بیوی گھومنے کے لئے باہر نکلے تو بیوی نے چاند کی طرف دیکھ کر اُمنگوں اور جذبات سے چھلکتی ہوئی آواز میں لالہ جی سے کہا" لالہ جی۔ ادھر دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے آج چاند کی چودھویں ہے!" اور لالہ جی نے ایک لمحے کے لئے عینک میں سے چاند کی طرف دیکھ کر کہا۔ "نہیں، میرے خیال میں پندرھویں ہے!" ——— اور جب یہ واقعہ سنا کر میں نے تمہاری ہنسی کے انتظار میں تمہاری طرف دیکھا تو تم نے اس لطیفے میں اس سوال سے ایک اضافہ کر دیا "تو کیا فیصلہ ہوا؟ چودھویں تھی یا پندرھویں؟" ——— سو شہاب، تم سے شیرازہ کا اتنا مفصل تعارف کرا کے میں سوچتا ہوں کہ بیکار تمہارا وقت ضائع کیا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ خط کے اس حصّے کو کاٹ دوں ایک سطر کاٹی بھی، مگر پھر کچھ ایسا لگا جیسے میں نے شیرازہ کے چہرے پر اپنے قلم کی تیز نوک سے ایک لمبی خراش ڈال دی ہے! ——— ویسے تم شاید شیرازہ میں دلچسپی نہ لو، لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ تم میری ذات میں ضرور دلچسپی لو گے، تمہارا خلوص ہی تو میری زندگی کا سہارا ہے، تم نے مجھے ہمیشہ اپنے پیار میں پناہ دی ہے اور اسی لئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم سودا کے اس شعر کو مشرق کی ازلی ایذا پسندی پر محمول کرنے کی بد مذاقی کے مرتکب ہوتے ہو، میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ اس روز جب میں حنیف کے ہاں سے اُٹھ کر آیا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے

دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے!

بہت دیر تک میں اپنے کمرے میں ٹیبل لیمپ پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بجلی کا بلب میری آنکھوں میں گھس گیا ہے، میں آنکھیں ملتا ہوا وہاں سے نکل آیا اور جب میں نے محسوس کیا کہ اب میری آنکھوں کی چکا چوند ختم ہو چکی ہے اور میں دیکھ سکتا ہوں تو میں حنیف کی کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا اور حنیف کی کوٹھی میرے مکان سے کوئی ڈیڑھ میل دُور ہوگی۔

میں بالکل ایک مسحور انسان کی طرح گھنٹی بجائے یا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر بلکہ اجازت لئے بغیر ڈائننگ روم میں جا نکلا جہاں سب لوگ کھانا کھانے کے بعد پھل کھا رہے تھے حنیف تو کود کر آیا اور مجھ سے چمٹ گیا۔ مجھے سینے سے بھینچ کر اٹھا لیا اور مجھے میز پر بٹھا کر میرے منہ میں ایک اتنا موٹا سا آلو بخارا ٹھونس دیا کہ میں اپنے جبڑے کو ذرا سی بھی جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ بچے بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ عصارہ مارے ہنسی کے کرسی میں گٹھڑی بنی پڑی تھی، حنیف کی امی بھی بے اختیار ہنس رہی تھیں حنیف ریفریجریٹر کے پاس مارے ہنسی کے اوندھا پڑا تھا اور شیرازہ ——— شیرازہ صرف مسکرا رہی تھی وہ مسکراتی رہی اور اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں ننھے ننھے ڈمپل مٹتے ابھرتے رہے!

شیرازہ صرف مسکراتی رہی۔ تقریباً سب لوگوں نے محسوس کیا کہ شیرازہ صرف مسکرا رہی ہے میں میز پر یوں الّو بنا بیٹھا ہوں اور وہ قہقہے نہیں مار رہی، صرف مسکرا رہی ہے، بچّوں کے سوا سب لوگ ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور انہیں سنجیدہ دیکھ کر شیرازہ نے اپنی مسکراہٹ جیسے جھپٹ کر سمیٹی اور کیلا چھیل کر چھری سے اس کے قتلے بنانے لگی!

پھر اچانک حنیف نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا "چلو بھئی اب کب تک یوں ہی کھاتے چلے جاؤ گے۔ اٹھو، ڈرائنگ روم میں چلیں۔ وہاں شیرازہ کی وائلن ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

"میں تو مالک بھائی جان سے میرا کا وہ بھجن بھی سنوں گی۔" میرا کے پربھو گردھر ناگر!" عصارہ مدّتوں کے بعد بولی،

اور حنیف اپنی اماں کے سامنے ادب سے جھک کر بولا "مبارک ہو امی۔ آج ہی

معلوم ہوا کہ آپ کی صاحبزادی کے منہ میں زبان بھی ہے" ——— اور عصارہ پھر اسی طرح کرسی پر گٹھڑی بن کر گنگنانے لگی۔

"مجھ سے تو عصارہ نے آج دوپہر سے اتنی باتیں کی ہیں" شیرازہ بولی "کہ اگر ان کا تار دیا جائے تو ستانوے ہزار نو سو انتالیس روپے دس آنے خرچ ہوں!"

قہقہوں کا تانتا بندھ گیا۔ اب کے شیرازہ بھی زور سے ہنسی۔ پھر انہی قہقہوں کے دوران میں حنیف بولا "آج تک مجھ سے عصارہ نے جو باتیں کی ہیں ان کا اگر تار دیا جائے تو یہی کوئی تیرہ چودہ آنے خرچ ہوں گے۔"

"کیوں؟ واہ!" عصارہ چہکی۔

اور حنیف بولا "لو بھئی چونی اور بڑھ گئی۔"

یوں ہی ہنستے ہوئے سب ڈرائینگ روم میں آئے، شیرازہ نے کسی کی فرمائش کا انتظار کئے بغیر مینٹل پیس پر سے وائلن اٹھائی اور اسے جیسے سر کرنے لگی۔ اتنے میں بیرا خوبصورت گلابی رنگ کے روسی سیٹ میں کافی لے آیا۔ سب نے اپنی اپنی پیالیاں اٹھالیں مگر شیرازہ بولی "ہائے! کافی؟ نہیں بھئی میں نہیں پیوں گی۔ میرے حصے کی پیالی وہ پی لے جو وائلن کے ساتھ گائے!"

حنیف اور میں دونوں بیک وقت اُٹھ کھڑے ہوئے! سب ہنسنے لگے مگر شیرازہ گھبرا سی گئی، پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "آپس میں فیصلہ کر لیجئے صاحب۔"

"ایک انار دو بیمار!" حنیف کی امی نے ہنس کر کہا۔

حنیف اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر میں نے ازراہِ تکلف کہا۔ "تمہی پی لو حنیف"

"میں ہی پئے لیتا ہوں" وہ بولا۔ اور شیرازہ کی پیالی اُٹھالی۔

اور شیرازہ نے وائلن پر کچھ ایسی راگنی چھیڑی جیسے کوئی رو رہا ہے، سسک سسک کر رو رہا ہے، روتا روتا جیسے کچھ سوچنے لگتا ہے، پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا ہے، پھر بھرائی ہوئی آواز میں دُعا کرتا ہے، اور دُعا کے دوران میں پھر سے رونے لگتا ہے!

"ہائے رے کم بختو!" حنیف کی امّی آنکھیں مل کر بولیں "لے کے کلیجہ مسوس ڈالا!"
اور وُہ اٹھ کر چلی گئیں۔

"ابا بادا آگئے!" حنیف نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ماؤں کا مذاق نہیں اڑاتے" میں نے کہا۔

"بہت اچھا شیخ سعدی صاحب!" حنیف مسکرا کر بولا۔

اور شیرازہ نے غصے سے وائلن بجانا بند کر دی تو اس میں سے جیسے ایک چیخ سی نکل کر رہ گئی "یہ بدمذاقی ہے" اس نے سچ مچ بُرا مان کر کہا "میں اپنے جگر کے خون کو ایک ایک سُر میں رچا رہی ہوں اور یہاں گپ لڑ رہی ہے!"

اسی سلسلے میں حنیف بولا "ڈاکٹر اقبال نے بھی تو "مسجد قرطبہ" میں کہا تھا کہ ——" اور وہ گانے لگا:-

"رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!"

اور ابھی وہ شعر کو ختم کرنے نہیں پایا تھا جب شیرازہ اسی کے طرز میں وائلن بجانے لگی اور مسکرانے لگی، شرما کر حنیف اقبال ہی کی اسی نظم کا آخری شعر گانے لگا اور دوسرے مصرعے میں مَیں نے بھی اس کا ساتھ دیا ؎

"نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر"

"ہم تو میرا کا بھجن سُنیں گے!" شعر کے ختم ہوتے ہی عصارہ زور سے بولی اور شیرازہ جیسے بدمزہ ہو کر صوفے میں گر پڑی، پھر اچانک وُہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "گائیے صاحب، وہی گائیے"

میں میرا کا بھجن گانے لگا اور ساتھ ساتھ شیرازہ کو وائلن بجاتے ہوتے دیکھنے لگا۔ وہ وائلن بجاتے ہوتے آنکھیں بند کر لیتی تھی اور کبھی کبھی یوں کھولتی تھی جیسے کچی نیند میں ہے، میں تمہیں کیسے بتاؤں شہاب کہ وہ اس عالم میں کتنی پیاری لگتی تھی، اس کا سارا

جسم ساز میں تحلیل ہو جاتا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے آواز وائلن میں سے نہیں نکل رہی، یہ اس کے تنفس کا نغمہ ہے۔

عصارہ میرا کا بھجن سُن کر چلی گئی، مگر ہم لوگ دیر تک گاتے بجاتے رہے اور جب ہم نے فیصلہ کیا کہ اب سو جانا چاہیئے تو شیرازہ یوں بے جان سی ہو کر صوفے میں گر پڑی جیسے اب تک وہ نغمے ہی کے سہارے زندہ تھی، ہم دونوں اس کی طرف لپکے مگر وہ ہماری گھبراہٹ پر مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ بہت تھکی تھکی تھی مگر اس تھکن میں ایک سرور تھا، ایک نشہ تھا جس کا تمہیں تجربہ نہیں ہو گا۔ تم جو سٹیٹسٹکس کو فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ سمجھتے ہو۔

اس وقت رات کا ایک بجا تھا، حنیف نے مجھے وہیں رُک جانے کو کہا مگر شیرازہ کچھ نہیں بولی، صرف جب میں نے اس کے قریب آکر "خدا حافظ" کہا تو چونک کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھی ہو بیٹھی، بولی "ارے! آپ چلے ہے" ---- اور وہ پھر سے آنکھیں بند کر کے صوفے میں ڈوب گئی۔

میں جب دروازے تک آیا تو وہ بولی "میں ڈرتی ہوں وائلن بجاتے بجاتے کبھی میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔"

میں ٹھٹک گیا اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے مسکرا رہی تھی اور جب حنیف نے اس سے پوچھا "بن رہی ہو یا سچ مچ؟"

تو وہ ہنس کر بولی "پہلے سچ مچ کچھ ہو رہا تھا۔ اب بن رہی ہوں۔"

میں وہاں سے چلا آیا۔ سڑک پر آکر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ڈرائینگ روم کے روشندان چمک رہے تھے، میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جا کر پھر پلٹ کر دیکھا۔ تو روشندان بدستور چمک رہے تھے، اور زندگی میں پہلی بار مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے حنیف میرا دشمن ہے۔

میں اپنے کمرے میں آگیا۔ خواب اور بیداری کے درمیان کسی کیفیت میں ساری رات گزر گئی، اور صبح کو ابھی میں مسہری میں سے نہیں نکلا تھا جب مجھے حنیف کی کار کا ہارن سنائی دیا۔

میں فوراً اُٹھا اور باہر لپکا۔ دروازے پر حنیف سے مڈبھیڑ ہوئی۔ "خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت کہاں یار" اس نے اُداسی سے کہا۔

اور مجھے ہاتھ سے کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔ جی میں آئی شیرازہ کا حال پوچھ لوں مگر دو باتوں نے روکا۔ حنیف میرا دشمن ہے اور ویسے مجھے شیرازہ کے بارے میں پوچھنے کا حق ہی کیا ہے، تیسری بات شاید بزدلی کی تھی جسے بعض اوقات اخلاقی مجبوری بھی کہہ لیا جاتا ہے۔

"بات یہ ہے" حنیف نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "کہ ایک بڑی ٹریجڈی ہوگئی، شیرازہ ہفتے بھر کے لئے ہمارے ہاں آئی، اور مجھے رات ہی کو، تمہارے جانے کے بعد تار ملا ہے مری سے کہ ماموں بسترِ مرگ پر ہیں اور میں فوراً مری پہنچوں، وہاں مجھے ہفتہ بھر تو ضرور لگے گا۔ شیرازہ تو یہ سن کر اتنی اداس ہوگئی ہے کہ امی کے اصرار کے باوجود اب تک چائے نہیں پی۔ کہتی ہے کھنڈت پڑ گئی، سارے پروگرام کا ستیاناس ہوگیا۔ وہ یہاں سے آج ہی چلی جائے تو رشتہ دار باتیں بنائیں گے کہ ایک ہفتے کی مہمان کو ایک دن میں ٹال دیا۔ اور شیرازہ بڑی جیتی جاگتی لڑکی ہے، گھر میں گھس کر بیٹھے گی تو بیمار ہو کر واپس جائے گی۔ اس ساری مشکل کا بس ایک ہی علاج ہے کہ تم اپنے وقت کی قربانی دو اور اس دوران میں دن بھر ہمارے ہاں رہو، بلکہ ممکن ہو تو رات بھی وہیں رہو، میرا کمرہ تمہارے لئے وقف ہوگا۔ میں تم سے درخواست کر رہا ہوں لیکن امی نے حکم دیا ہے کہ مالک کو لے آؤ۔"

میرا ذرا سا تکلف کرنے کو جی چاہا۔ میں نے کہا "میں چلا آتا مگر ——"

"مگر وگر کچھ نہیں۔" حنیف کود کر اُٹھا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اور جیسے مجھے ڈانٹنے لگا "میں نے ذرا شریف آدمی بن کر بات کی تو حضور کے دماغ ہی نہیں مل رہے، چلو۔" وہ مجھے کھینچنے لگا۔

"ارے بھئی کپڑے تو بدل لوں۔" میں نے فریاد کی۔

"بدل لو —— پانچ منٹ دیتا ہوں۔" وہ بولا

کپڑے بدل کر میں نے چند کتابیں اُٹھائیں اور اس کے ساتھ کار میں آبیٹھا۔ کچھ دیر وہ

خاموش بیٹھا رہا، پھر کچھ یوں جیسے مجھے کوئی بہت بڑا راز بتانے چلا ہے بولا "سنو ملے۔ بات یہ ہے کہ ——" وہ رُک گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا

"کچھ نہیں" وہ بولا اور کار کی رفتار تیز کر دی۔ "میں تمہیں شیرازہ کی مدارات کے سلسلے میں کچھ ہدایات دینے لگا تھا مگر پھر سوچا کہ تمہیں ہدایات دینے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو ہدایات دے رہا ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بولا ہے اور بات کچھ اور تھی مگر اس کا رنگ کچھ ایسا زرد ہو رہا تھا، اور اس پر کچھ ایسی اعصابی کیفیت طاری تھی کہ میں نے مزید جرح مناسب نہ سمجھی۔

ہم کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے تو شیرازہ اور عصارہ لان میں ٹہل رہی تھیں اور حنیف کا ننھا سا کتا ان کے ساتھ ساتھ بڑے ادب سے چل رہا تھا۔

مجھے کار سے نکلتا دیکھ کر ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کار کی طرف آنے لگیں۔ دُور ہی سے شیرازہ بولی "معاف کیجئے گا آپ بھی کہیں گے کہ یہ ایک عجیب فرض ادا کرنا پڑ گیا ہے مگر جب حنیف کو آپ پر اتنا اعتماد ہے تو بتایئے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ حنیف چلا گیا تو باقی رہ جاتی ہے عصارہ جو پردہ کرتی ہے، آخر کبھی سینما دیکھنے کو بھی جی چاہے گا، باغ میں گھومنا بھی ہوگا، گانے بجانے پر بھی کبھی طبیعت آ جاتی ہے۔ کچھ انٹلکچوئیل گفتگو کی بھی پیاس رہتی ہے اور حنیف کے جانے کے بعد میں گھر میں تو خیر رہوں گی لیکن اپنے آپ میں نہیں رہوں گی، آپ کو تکلیف تو بہت ہوگی لیکن ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر،

حنیف سے آپ کی دوستی ہے تو یہ بیگار بھی بھگتئے۔"

ہم سب ہنس پڑے اور میں نے چند مناسب الفاظ میں اپنی مسرت کا اظہار کیا، کار میں حنیف کا سامان رکھا گیا۔ پھر اسے رخصت کیا گیا۔ اس کی امی نے تیمارداری کے سلسلے میں چند ہدایات دیں اور رو رو کر اپنے بھائی کی صحت کے لئے دُعا کی۔ اور ڈرائیور کار کو

بڑی تیزی سے باہر سڑک پر لے گیا۔

یہ میں نے تمہیں صرف بارہ چودہ گھنٹے کی روداد لکھی ہے مگر اتنی تفصیل سے کام لیا ہے جیسے برسوں کی تاریخ دہرا رہا ہوں، اب مجھے ہفتے بھر کی کہانی لکھنی ہے، مگر اتنے اختصار سے کام لوں گا جیسے یہ ایک پل کا ذکر ہے اور یہ ایک ہفتہ ایک پل ہی میں تو گذرا۔ کانوں کان پتہ ہی نہیں چلا کہ ایک بدھ کے بعد دوسرا بدھ بھی آ گیا ہے اسی لئے تو میں تم سے کہتا تھا کہ تم ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عمر پاؤ گے، تمہارا ایک مہینہ ایک برس میں گزرتا ہے نا، رینگتا گھسٹتا۔ سو تم اگر اسی برس کی عمر پاؤ گے تو تقریباً ایک ہزار برس کاٹو گے اور یہاں ایک ہفتہ ایک پل میں کٹ گیا، اتنا بھی تو علم نہیں ہوا کہ رات کب آئی اور دن کب نکلا۔ ان دنوں وقت مر گیا۔ کائنات کی ہر چیز جیسے ٹھٹک کر شیرازہ کو اور مجھے دیکھنے لگی، سینما جاتے ہوئے، باغوں میں گھومتے ہوئے، سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے، وائلن بجاتے اور میر کی غزلیں اور میرا کے بھجن گاتے ہوئے، ایک دوسرے کو مسلسل دیکھتے اور دیکھتے رہ جاتے ہوئے، عصارہ پاس بیٹھی ہے تو کیا ہوا، بچے دروازے سے لگے گیت سن رہے ہیں تو حرج ہی کیا ہے، حنیف کی امی کبھی کبھی آنکلتی ہیں تو کیا مضائقہ ہے شیرازہ کی ایک فصیح و بلیغ مسکراہٹ ان لمحوں کے دوران میں گھنٹوں میرا ساتھ دے سکتی ہے، اور مجھے معلوم ہے کہ جب تنہائی ہوگی تو ایک ایسی ہی بولتی چالتی مسکراہٹ کچھ کہتی ہوئی جھجک، گالوں پر ڈمپل اور ہلال کی سی قوس کی پر معنی جلوہ گری۔ مجھے یہ سب کچھ ملے گا —— اب ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چل سکتے تھے۔ کندھے سے کندھا لگا کر تصویروں کے البم دیکھ سکتے تھے، شیرازہ میری ٹائی باندھ سکتی تھی، میں اس کے کانوں کی لَویں پکڑ کر ٹاپس کا رخ درست کر سکتا تھا۔ ایک روز میری سگریٹ کی راکھ کا ایک ذرہ اڑتا ہوا اس کے ہونٹ پر جا بیٹھا تو میں نے کہا "اسے جھاڑ دیجئے"۔ وہ بولی "آپ ہی جھاڑ دیجئے"۔ اور میں نے انگلی سے ذرہ جھاڑ دیا۔ ایک دن جب وہ مجھے وائلن کا سبق دے رہی تھی تو بولی "آپ تو پیدائشی آرٹسٹ معلوم ہوتے ہیں، مستقل مزاجی سے مشق کرتے رہیئے تو آپ استاد ہو جائیں گے وائلن کے"۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میں خاصا مستقل مزاج ہوں"۔

وہ بولی: "خونِ جگر کھپانا پڑتا ہے، مستقل مزاجی کا دُوسرا نام ضد ہے۔ اور جو ضدی نہیں ہوتا وہ نہ اچھا آرٹسٹ ہوتا ہے نہ اچھا انسان"
"میں ضدی بھی ہوں" میں نے کہا "مجھے وائلن پسند آگئی ہے تو اپنی یہ ضد ہر حال میں پُوری کروں گا، مجھے کوئی بھی چیز پیاری لگے تو اسے پیار کرتا چلا جاتا ہوں، میں بڑا ضدی ہوں"
"میں بھی ضدی ہوں" وہ بولی۔ اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف کچھ یوں دیکھا کہ اگر عصارہ نہ آجاتی تو شاید ایک دوسرے سے لپٹ جاتے۔

اسی شام کو شیرازہ کے نام حنیف کا تار آیا کہ ماموں اب تندرست ہیں اور وُہ بُدھ کی صبح کو واپس آرہا ہے۔ زندگی میں دوسری بار مجھے محسوس ہوا کہ حنیف میرا دشمن ہے۔
سچ کہتا ہوں مَیں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ مَیں حنیف کے ہاں مقیم ہوں اور حنیف کے آتے ہی مجھے یہاں سے چل دینا ہوگا۔ سب لوگ حنیف کا تار ملنے سے بہت خوش تھے، مگر ـــــ سب چلے گئے تو میں کوشش کے باوجُود اپنی اداسی اور سنجیدگی کو چُھپا نہ سکا۔
شیرازہ بار بار "کیا بات ہے مالک صاحب؟ آخر بات کیا ہے؟" کچھ یوں کہتی تھی جیسے وُہ یہ سوال اپنے آپ سے بھی پوچھ رہی ہے "کیا بات ہے شیرازہ؟ آخر بات کیا ہے؟" ـــــ
میں اس کے سوال کا بڑا موزوں جواب دینا چاہتا تھا لیکن اس روز بار بار حنیف کے بھائی اور امّی اور عصارہ آجا رہے تھے، سینما کا وقت بھی نکل گیا تھا، باہر بوندا باندی ہو رہی تھی اس لئے گھومنے جانے کا سوال بھی ختم ہو گیا تھا۔ سو میں "کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں" کہہ کر اسے ٹالنے کی کوشش کرتا مگر اسے کرید تھی "کچھ تو ہے؟ آخر کیا بات ہے؟"

پھر اس نے وائلن بجانا شروع کی۔ اور آج پہلی بار وہ بجاتے بجاتے رونے لگی، پھر ایک دم اس نے وائلن کو صوفے میں پھینک دیا اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی اور میں اکیلا بیٹھا وائلن کو دیکھتا رہا، پھر میں نے اُٹھ کر وائلن پر اپنے ابتدائی سبق دُہرانا شروع کر دیئے اور میر کی یہ غزل گانے لگا:۔

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

میں یہ غزل گاتا رہا اور جب آخری شعر پر پہنچا تو شیرازہ لال چہرہ لئے سامنے کے کمرے سے نکلی اور جیسے ٹھٹک کر یہ شعر سننے لگی ؎

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بلب نہیں آتا

ادھر سے عصارہ آ گئی اور شیرازہ سے "تالب" اور "تابلب" کی بحث چھیڑ دی، اس وقفے میں ہم دونوں سنبھل گئے مگر جب حنیف کی امی نے آ کر کہا کہ باہر بارش ہے اور ملازم میرے لئے ٹیکسی لے آیا ہے ——— تو میں نے شیرازہ کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے لاہور میں چھوڑ کر خود میکسیکو جا رہا ہوں!

حنیف کی امی چلی گئیں تو میں نے کہا "خدا حافظ"

شیرازہ کچھ نہیں بولی۔ وائلن اُٹھا کر اسے ذرا سا یوں بجایا کہ ایک کراہ سی ٹیکسی تک میرا تعاقب کرتی گئی۔

اس کے بعد کی بات بہت مختصر ہے، دوسرے دن حنیف آ گیا۔ خوب چہل پہل رہی، میں بھی خوب ——— بن کر ہنستا رہا، شیرازہ کے ہونٹوں کے گوشوں کے ڈمپل بھی ہونٹوں کی طرف سفر کرتے رہے مگر اس کی ایک رٹ دن بھر جاری رہی۔ "میں کل صبح جا رہی ہوں، مجھے ہر حال میں جانا ہے، امی کو انتظار ہوگا" پہلے تو سب نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر جب سب کو محسوس ہوا کہ وہ غصے میں آ گئی ہے اور بڑی تلخی سے انکار کرنے لگی ہے تو حنیف صرف اتنا بولا "تم بھی منت کر دیکھو مالک" میں نے شیرازہ کی طرف دیکھا مگر اچانک اس نے نظریں اُٹھا کر مجھے کچھ یوں دیکھا جیسے ٹوٹ کر رو دے گی "میں کیا کہہ سکتا ہوں" میں نے بے بس ہو کر کہا اور سب خاموش ہو گئے۔

حنیف کچھ دیر کرسی میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر اچانک کود کر اُٹھا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔ آخر جانا تو ہے ہی۔ تو یہ تھوڑا سا وقت جو باقی ہے اسے ہنس کھیل کر کیوں نہ گزارا جاتے!"

سب نے اتفاق کیا۔ شیرازہ بھی نرمی سے بولی "کوئی پروگرام بناؤ"

"شام کو ایک بہت بڑی دعوت ہوگی اور رات کو دو بجے تک جاگا جائے گا اور گایا بجایا جائے گا۔ اور اگر عصارہ مان گئی تو ناچا بھی جائے گا۔"

"ناچوں گی۔" عصارہ بولی۔

پھر پروگرام کی تفصیلیں طے کی گئیں۔ اسی روز تمہیں مری جانا تھا سو تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس روز میرا تمہارے پاس آنا یا تمہیں اسٹیشن پر چھوڑنے جانا کتنا مشکل تھا۔ دل میں ذرا احساس گناہ ضرور تھا کہ میں نے شیرازہ کی ہفتے بھر کی دوانست پر شہاب کی پندرہ برس کی دوستی کو قربان کر دیا۔ مگر شہاب، دیکھو، جب پُرانی شمع کے سامنے ایک روشن قندیل جل اُٹھے تو پرانی شمع کو پتنگے سے شکایت نہیں ہونی چاہیئے، قندیل بجھے گی تو پتنگا خود بخود ادھر کا رُخ کرے گا۔ سپردگی کے وقت اگر تمام حواس انسان کا ساتھ دیتے ہیں تو ساتھ ہی انسان بے حس بھی ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے نا؟ مگر یہ میں تم سے کیوں پوچھ رہا ہوں؟

میں اس دن اور رات کے ہنگاموں، خاموشیوں اور سوچوں کو نہیں دُہراؤں گا۔ رات کے ڈھائی بجے جب شیرازہ وائلن کو ایک کراہ پر ختم کر کے صوفے میں گر پڑی تو میں نے دیکھا کہ حنیف حواس باختہ ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اسے سہارا دیا اور اس کے چہرے پر آئی ہوئی ایک لٹ کو ہٹا کر بولا۔ "شیرازہ" اور شیرازہ چونک اُٹھی اور سنبھل بیٹھی "یوں ہی ہوگا۔" وُہ بولی۔ "یہ وائلن تو مجھے ختم کر ڈالے گی۔ لوگ اسے بجانے کے لئے بجاتے ہیں۔ میں اس میں اپنا خونِ جگر کھپا دیتی ہوں۔ توبہ!"

اٹھ کر اس نے ایک انگڑائی لی، مگر نامکمل اور ٹوٹی ہوئی سی، پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "اچھا وقت کٹ گیا۔"

میں نے کہا۔ "یادگار وقت کٹا۔"

حنیف بولا۔ "یہ رات تو ہماری زندگیوں کی دِلّی پر نادر شاہ کا حملہ ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" شیرازہ بولی۔ "کوئی ڈھب کی تشبیہہ سوچی ہوتی۔"

میں نے جیسے میدان مارنے کے لئے کہا۔ "یہ رات تو ہماری زندگیوں کے ویرانوں پر گھٹا بن کر برس گئی ہے۔"

شیرازہ مسکرا کر بولی "آپ کے دس ہیں سے پانچ نمبر ہیں۔ اور حنیف کے منفی پانچ"
حنیف اداس سا ہو گیا مگر میں کھل اٹھا اور شیرازہ ہمارے تیوروں سے خاصی محظوظ نظر آئی۔

حنیف مجھے اپنی کار میں میرے گھر تک چھوڑ گیا۔ راستے میں اس نے مجھے صرف یہ بتایا کہ "شیرازہ تمہاری بہت تعریف کر رہی تھی۔ امی اور عصارہ بھی کہہ رہی تھیں کہ انہیں تمہاری موجودگی میں میری غیر موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔ شیرازہ تو کہہ رہی تھی کہ اس نے تم جیسے مہذب اور خوش ذوق نوجوان بہت کم دیکھے ہیں۔"

پھر وہ جیسے میرے جواب کا انتظار کرنے لگا مگر میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا اور اس نے بھی شاید مجھ سے میری رائے طلب نہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔

دوسرے روز صبح کو جب ہم شیرازہ کو اسٹیشن پر چھوڑنے گئے تو شیرازہ بہت اداس تھی، کبھی کبھی وہ عصارہ سے کوئی بات کر لیتی اور بس۔ حنیف بھی خاموش رہا اور میری کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے کوئی مجھ سے بات کرے گا تو دھاڑیں مار کر رو دوں گا، گارڈ نے سیٹی بجائی تو میرے سارے جسم میں جیسے سوئیاں سی چبھ گئیں اور آنکھوں میں سیسہ بھر گیا۔ شیرازہ جب سب سے ہاتھ ملاتی ہوئی میرے پاس آئی تو بولی "بڑا اچھا وقت کٹا"

"بڑا یادگار وقت کٹا" میں نے کہا۔

اور اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں ننھے منے بلبلوں کے سے ڈمپل ابھرنے مٹنے لگے اور اس کے پپوٹوں کے ساتھ ساتھ نمی کا ایک نقرئی حاشیہ سا بن گیا۔ وہ فوراً پلٹی اور گاڑی میں چلی گئی، پھر شاید آنکھیں پونچھ کر دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ گاڑی چلی تو وہ دُور تک ہماری طرف دیکھتی چلی گئی، ہم نے ہاتھ ہلائے تو اُس نے بھی رومال ہلانا شروع کیا اور شہاب، میں جانتا تھا کہ اس رومال میں آنسو تھے۔ اور یہ آنسو صرف میرے لئے بہائے گئے تھے اور اس نے صرف مجھ پر نظریں جما رکھی تھیں۔ تم کہو گے کہ مجھے اتنے فاصلے سے اس کی نظروں کے رُخ کا کیسے علم ہوا۔ تو اس راز کو تم کیا سمجھو گے۔ مجھے ایمان کی حد تک یقین ہے کہ وہ صرف مجھ کو دیکھ رہی تھی اور صرف میرے لئے رو رہی تھی۔

اس کے جانے کے بعد تمہارے بہت سے خط آئے مگر شیرازہ کے جانے کے بعد میں لٹ سا گیا تھا نا۔ میں تمہیں کیا لکھتا اور کیسے لکھتا۔ میں دو روز حنیف کے پاس بھی نہ گیا۔ تیسرے روز وہ خود آ گیا اور شکایت کی، میں نے کہا۔ "آج تین روز سے میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

"جسم تو میرا بھی ٹوٹ رہا ہے۔" وہ بولا "مگر میں تمہاری طرح طوطا چشم نہیں ہوں۔"

مجھ جیسے اُس نے گالی دے دی۔ "طوطا چشم؟" میں نے کہا "کیا بک رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "اس روز تم نے اپنی کنپٹی بلیڈ سے کاٹ لی تو میرے پاس بھاگے آتے تھے اور تیمارداریاں کروائی تھیں، اب تین دن سے جسم ٹوٹ رہا ہے تو ———" وہ رو دینے کی حد تک سنجیدہ ہو گیا۔

میں اُٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔ شیرازہ کے جانے کے بعد میرے دل میں پھر حنیف کی دوستی کا جذبہ جاگ اُٹھا تھا۔

چند روز بعد حنیف نے مجھے رقعہ بھجوایا کہ وہ ایک انٹرویو کے سلسلے میں کوئٹے جا رہا ہے جس روز وہ کوئٹے روانہ ہوا اسی روز مجھے شیرازہ کا ایک خط ملا، مختصر سا خط تھا مگر بڑا گمبھیر خط یہ تھا:۔

مالک!

آج سوداؔ کا ایک شعر کسی سے سنا ہے، جی چاہا تم تک پہنچا دوں۔ میں ہر نعمت کو بانٹ کے کھاتی ہوں۔ تم اور حنیف میرے "خونِ جگر" کی تکرار پر بہت ہنستے تھے، یہ شعر پڑھو گے تو شاید تم روؤ نہیں مگر سوچو گے ضرور، سنو:۔

زخم کی طرح تو اس دہر میں کاٹ اپنی عمر
رو لے یا ہنس لے بس اتنا ہے کہ ٹک درد کے ساتھ

شیرآزہ

جی چاہا اس خط کو فریم میں جڑوا کے دیوار پر لٹکا لوں، ایک تو صرف "مالک!" جو ذو معنی ہے

یا کم از کم مجھے ذو معنی لگا۔ دوسرے "تم" کا خطاب اور پھر آخر میں "خیر اندیش شیرازہ" کے بجائے صرف "شیرازہ" اور پھر سودا کے اس شعر کا یہ ٹکڑا "بس اتنا ہے کہ ٹک درد کے ساتھ ــــــ"

اس خط کے بعد تو میں سراپا درد بن گیا۔ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں تھا اور عصارہ سے پوچھنے میں "اخلاقی مجبوری" حائل تھی اس لئے میں حنیف کے انتظار میں تھا کہ وہ آتے تو اس سے پوچھ لوں، اور یہ خط دکھا کر اسے اپنا ہمراز بنا لوں۔

لیکن حنیف چند روز کا وعدہ کر کے گیا تھا اور ایک مہینے تک واپس نہ آیا۔ ایک روز میں اس کے ہاں گیا تو عصارہ نے بتایا کہ اس کی امی بھی چند روز ہوئے کوئٹہ چلی گئی ہیں اور شاید ماں بیٹا وہاں سے کراچی بھی جائیں۔ "بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا

"جانے!" عصارہ بولی

ایک لمحے کے بعد وہ بولی۔ "میرے پاس آپ کی ایک چیز ہے۔"

"کیا؟"

"بس ہے، آپ میرا وہ گیت سنائیں گے تو دوں گی۔"

میں نے کہا۔ "وائلن ہوتی تو سناتا۔"

"وہی تو ہے" وہ ہنس کر بولی۔ "وائلن ہی تو ہے۔ شیرازہ آپا دے گئی تھیں۔"

"کب؟" میں نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"کب! جب آئی تھیں۔ جب جانے لگی تھیں۔"

میں مارے حیرت، مسرّت اور صدمے کے خاموش رہا۔

"کہہ گئی تھیں، مالک بھائی کو دے دینا۔ انہیں وائلن سیکھنے کا شوق ہے، اپنے سبق دہراتے رہیں گے۔ میں اور لے لوں گی، میں نے بے ایمانی سے اسے اپنے پاس رکھ لیا کہ خود بھی سیکھوں پر مجھ سے تو وہ بجتی ہی نہیں۔ اب وہ گیت سنانے کا وعدہ کیجئے تو لاؤں۔"

"سناتا ہوں۔" میں نے کہا اور نہ جانے کیسے اس ایک لمحے میں مجھے احساس ہوا کہ

میں نے تمہارے خطوں کے جواب نہ لکھ کر بڑا ظلم کیا۔ شاید یہ اس آسودگی کا معجزہ تھا جو شیرازہ کی وائلن پاکر مجھے حاصل ہوئی تھی۔

میں نے عصارہ کو وائلن پر میرا کا گیت سنایا۔ اور جب میں وائلن کو کیس میں بند کرکے آنے لگا تو عصارہ بولی "مالک بھائی، آپ بڑا اچھا گاتے ہیں۔"

آج عصارہ جانے کیوں جذباتی ہو رہی تھی۔

گھر آکر میں نے وائلن کو کیس میں سے نکالا اور ان حصّوں کو دیکھنے لگا، جنہیں شیرازہ کے ہاتھ چھوتے تھے اور جس حصّے کو اس کی ٹھوڑی کبھی کبھی مس کر جاتی تھی۔ مجھے اس وائلن میں سے شیرازہ کی خوشبو آنے لگی۔ اور پھر ملازم نے مجھے حنیف کا ایک خط لاکے دیا۔ یہ کراچی سے آیا تھا، لکھا تھا۔

"مالے

تم یہ سن کر بہت خوش ہوگے کہ آج سے دس روز بعد یعنی یکم اگست کو میری شادی ہو رہی ہے، اور جانتے ہو کس سے؟ شیرازہ سے۔ امّی نے احسان کیا کہ یہاں آکر یہ انتظام کر لیا۔ تم یہ خط دیکھتے ہی کراچی چلے آؤ اور مجھے تار دے دو، میں اسٹیشن پر آجاؤں گا۔ عصارہ کو بھی لکھ رہا ہوں۔ وہ اور چھوٹے بھائی اور دو ملازم بھی فوراً کراچی چلے آئیں گے، سو تم بھی فوراً چلے آؤ، شیرازہ کہتی ہے کہ وہ اپنی وائلن عصارہ کے پاس چھوڑ آئی ہے، وہ خود لیتے آنا یا عصارہ سے کہنا کہ بکس میں رکھ لے، امّی پیار کہہ رہی ہیں۔

تمہارا اپنا حنیف

سب سے پہلے میں نے اپنے دشمن کے خط کے پُرزے اڑا دیئے، پھر وائلن کو دیوار پر دے مارا اور پھر شیرازہ کے خط کو پھاڑنے ہی لگا تھا کہ رعشے سے میرے پاؤں اکھڑ گئے، اور میں دھب سے پلنگ پر گر کر یوں بلک بلک کر رونے لگا کہ میرا ملازم اندر بھاگا آیا اور زار زار روتے ہوئے مجھے تھپکنے لگا۔

اگر کچھ دیر کے بعد مجھے حنیف کی کار کا ہارن نہ سنائی دے جاتا تو یہ ممکن ہے، اپنا

ذہنی توازن ہی کھو بیٹھتا، مگر ہارن کی آواز سنتے ہی میں تڑپ کر اُٹھا اور غسل خانے میں بھاگ گیا۔ عصارہ "مالک بھائی" کہتی ہوئی آئی، اور پھر شاید ملازم کے بتانے پر خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

میں نے منہ دھویا اور تولیہ سے ہاتھ پونچھ رہا تھا کہ اس نے کواڑ کوٹ ڈالے "ارے نکلئے بھی نا" وہ چلائی۔ "آپ کو ایک خوش خبری سنانے آئی ہوں۔"

میں دروازہ کھولتے ہی بولا "مبارک ہو عصارہ، مجھے بھی ابھی ابھی خط ملا ہے، بڑی خوشی ہوئی۔"

وہ مارے مسرت کے لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ بولی "آپ چل رہے ہیں نا؟"

"ہاں" میں نے کہہ دیا "مگر کچھ کام ہیں، دو تین روز بعد آؤں گا۔"

"آئیں گے تو" وہ بولی۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ کر پھر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے پہلے سے پتہ تھا۔ آثار ہی ایسے تھے۔"

"آثار تو کچھ اور تھے" میں نے وائلن کی طرف دیکھ کر سوچا اور بڑی اداسی سے اس سے پوچھا "اس وائلن کے بارے میں حنیف نے کچھ لکھا ہے؟"

"نہیں تو" وہ بولی "اس کے بارے میں کیا لکھیں گے وہ؟"

"کچھ نہیں" میں نے کہا

اور وہ جیسے کچھ سوچتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھی "اچھا تو بھیا سے کیا کہہ دوں؟"

"مبارک باد کہنا" میں نے کہا "اور کہنا کہ ضرور آؤں گا، کیوں نہیں آؤں گا۔"

وہ کچھ خوش کچھ اداس چلی گئی، اور پھر شاید کراچی چلی گئی۔ اور پھر شاید شادی بھی ہو گئی۔ لیکن مجھے ان باتوں کی کیا پروا تھی۔ عصارہ کے جاتے ہی میرا دُکھ آگ بن گیا اور میں نے تہیّہ کر لیا کہ میں اس ذلّت کا بدلہ لوں گا۔ میں نے ان چند ہی روز میں آوارہ گردی کی انتہا کر دی، میری زندگی اپنے محور سے پوری طرح ہٹ گئی، میں نے ان چند ہی دنوں میں اپنی ایک ہم جماعت سے عشق شروع کر دیا۔ اور پھر چند ہی روز کے اندر میں نے اس سے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا۔ اس کے والدین بھی مان گئے۔

مَیں نے ایک خوشبو دار کاغذ پر حنیف کو بالکل اسی مضمون کا ایک خط لکھا جس مضمون کا اس نے مجھے لکھا تھا:۔

حنیف

تم یہ سن کر یقیناً بہت خوش ہو گے۔ کہ ، ار اگست کو میری شادی ہو رہی ہے اور جانتے ہو کس سے ہ لطیفہ سے، مَیں نے بڑی آسانی سے یہ انتظام کر لیا۔ تم اور شیرازہ یہ خط دیکھتے ہی لاہور چلے آؤ، اور مجھے تار دو، میں اسٹیشن پر آ جاؤں گا، شیرازہ کی وائلن میرے پاس محفوظ ہے۔ ذرا سی ٹوٹ گئی ہے مگر مرمت کرالی جائے گی،

تمہارا اپنا مالک

اور آج مجھے بجائے حنیف کے شیرازہ کا خط ملا ہے۔ لکھا ہے :۔

مالک صاحب

کیا آپ کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ جس پیار کی آبیاری کسی نے اپنے خونِ جگر سے کی تھی، اسے آپ یوں اپنے پاؤں تلے روند دیں گے، آپ کو اپنے آپ سے شرم آنی چاہیئے۔ آپ تو کہتے تھے آپ ضدی ہیں مگر آپ بڑے کم ظرف اور اُتھلے مزاج کے آدمی نکلے۔ میرا نہیں تو عصارہ کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔

شیرازہ

خُدا کے لئے مجھے یہ معمّہ سمجھاؤ اور ذرا سوچو کہ تمہارے نام کا یہ خط کس کے خونِ جگر سے لکھا گیا ہے!

مالک

دار و رسن

نتھو تیس برس کا تھا جب اِدھر اس کا باپ مرا اور اُدھر اس کے ایک بیٹے پر چوتھی بیٹی پیدا ہوئی۔ اور خاندانی ذمہ داریوں کا ایک بوجھ اس کے کندھوں پہ ٹوٹ پڑا۔

"نتھو رے" اس کی ماں نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو بڑے پُراسرار دائروں کی صورت میں ہوا میں یوں لہرایا جیسے بین کرنے چلی ہے اور چند لمحوں کے لئے خوب خوب رو کر انگلی کو بدستور دائروں میں لہراتے ہوئے اس نے بین کرنے شروع کر دیئے "میرے سر کے پھول کو موت توڑ لے گئی رے نتھو، آج میری پتنگ آدھ آسمان پر کٹ گئی، وہ جُما جس نے ایک نہ دو پورے تو کم دو سو جوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا، خود بھی اسی گھاٹ اتر گیا رے نتھو۔ اور تیری گھر والی کے دیدوں کا پانی ایسا ڈھلا کہ اِدھر تیرے باپ نے دم توڑا اُدھر اس نے ٹھک سے ایک چھوکری جن دی اور جتنی بھی تو چھوکری لے نتھو، حیا نہ آئی اسے کہ آج اسی کے نتھو کے سر کا چھتر ٹوٹ رہا ہے رے نتھو۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو پیشاب کے بہانے کہیں ویرانے میں جن کر گاڑ آتی پر گھرانے کے ماتھے کا کلنک نہ بنتی رے نتھو۔ انگلیاں نہ اٹھتیں۔ ٹھٹھے نہ ہوتے ناکوں پر دوپٹے رکھ کر ٹھیں ٹھیں ہنسا نہ جاتا رے نتھو۔ اب تُو اس کلنک کو یوں دھو سکتا ہے کہ قاتل جوانوں کو مارنے میں اپنے باپ کی سی ہاتھ کی صفائی دکھا نا رے نتھو۔ تیرے باپ کے پاس صاف ستھری روئی کی سی نرم موت کا ہنر تھا رے نتھو۔ اس کی لاج رکھنا رے نتھو۔ ہائے رے نتھو!"

اس لمبے بین کے بعد وہ کھڑے ہوتے نتھو کی ٹانگوں میں سر چھپا کر یوں کڑک کڑک

کر رو ئی تھی کہ دیوار کے ساتھ ساتھ دُور تک بیٹھی ہوئی رشتہ دار عورتوں اور پڑوسنوں میں سے ایک بولی "مزا آیا نا رونے کا۔ سر کا سائیں مر جائے اور یوں پھڑک پھڑک کر نہ رویا جائے تو یہ رونا تو نہ ہوا، بلونا ہوا۔ اور اُدھر بہو کو دیکھو۔ اِدھر آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور وہاں دودھ پلوائے جا رہے ہیں اور دایہ سے پیڑو دبوائے جا رہے ہیں۔ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں کیا کم تھیں کہ چوتھی بیٹی کے لئے اتنی بے صبر ہو گئی۔ موقع محل تک نہ دیکھا۔ ہائے ری کیسی الٹی صدی آ گئی ہے، بندوق سے چیونٹی کے شکار ہو رہے ہیں، آسمان پر تھگلی لگ رہی ہے ——— ہا!"

"ہا!" سب عورتوں نے گہری ٹھنڈی سانسیں لیں اور نتھو ناک پر پگڑی کا ایک پلو رکھے ماں کے پاس سے ہٹا اور پرلی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے گڑ کر رہ گیا ہے۔

نتھو کا بیٹا گلی سے بھاگتا اور کودتا ہوا آیا مگر باپ کو یوں اداس کھڑا دیکھ کر ذرا سا رکا اور پھر باہر چلا گیا۔

اندر کوٹھے میں سے نتھو کی بیوی کی کراہوں اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

نتھو کی ماں رینگتی ہوئی پڑوسنوں کے پاس آ بیٹھی اور اطمینان سے آلتی پالتی مارنے کے بعد زار زار رونے لگی۔

"یوں پھوٹ پھوٹ کے اور ٹوٹ ٹوٹ کے تو نہ روئے گی ماسی تو اور کیا تیری بہو روئے گی؟" ایک پڑوسن بولی "ماں تو تیرا ہی ٹوٹا ہے نا۔"

"میرے ماں کی کیا بات کرتی ہو بیٹی؟" بڑھیا نے ٹھسک ٹھسک روتے ہوئے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں اور شہادت کی انگلیوں سے ایک دائرہ سا بناتے ہوئے کہا "یوں طباق سا چہرہ تھا مرنے کے بعد جیسے پندرھویں کا چاند گھڑی مار کر ابھرے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسے پھول کھل رہا ہو۔ ایسا پھول سا ہلکا ہاتھ مرنے والے کا کہ سنتے ہیں ادھر جوان کے قدموں تلے سے تختہ کھسکا اُدھر وہ جُھمّے کے بناتے ہوئے پھندے میں یوں لٹک گیا جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے۔ آنکھ کے ایک پلکارے میں جان ہوا۔ یہ نہیں کہ تختہ گرا اور پھانسی پانے والے نے پھڑک پھڑک کے رسّہ ہی توڑ دیا۔ اور یہ میرا نتھو

بے چارہ ۔ اس نے تو اپنے باپ تک کو مرتا نہیں دیکھا۔ اپنی لاڈو کے لئے دایہ لانے گیا ہوّا ننھا بھولا بادشاہ، کہ ادھر باپ چلتا بنا۔ یہ کیسے دے گا پھانسیاں ۔یہ کیسے دیکھے گا ابلی ہوئی آنکھیں اور کھچی ہوئی باچھیں ۔اور وہاں پھانسی پر تو بڑے بڑے کڑیل جوانوں کی گردنیں تڑ سے ٹوٹ جاتی ہیں اور ہاتھ ہاتھ بھر لمبی ہو جاتی ہیں اور زبانیں دھجیوں کی طرح لٹک کر ٹھوڑی پر آ رہتی ہیں اور ناک اور منہ سے خون پھوٹ پڑتا ہے ——— ہائے رے میرا ننھو"

عورتوں کو ننھو کی ماں کی یہی عادت بری لگتی تھی کہ آسمان کی بات کر دیا زمین کی، وہ اپنی بات کو جُمّن کے کمالِ فن پر ختم کرتی تھی "مارنے کو ہنر بنا ڈالا ہے ننھو کے باپ نے ۔ پھانسی نہیں دیتا، غُبارے میں کانٹا چبھوتا ہے ۔ ابھی یوں پھولا پھولا کُپا سا لگ رہا ہے اور ابھی جھُریوں پڑا چیچھڑا ۔"

محلّے اور برادری کی بڑی بوڑھیاں تو خیر اب تک اس کی باتیں برداشت کر لیتی تھیں مگر جب نئی نویلی بہوئیں ان گھروں میں آتی تھیں اور چاچا جُمّن کے کارنامے سنتی تھیں تو کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتی تھیں ۔ چیخ چیخ اٹھتی تھیں اور چند ایک پر تو جن تک آ گئے تھے، مگر ننھو کی ماں تھی کہ اپنی رٹ سے باز نہیں آتی تھی ۔ جُمّن تک نے اسے منع کیا مگر وہ رہ نہ سکی ۔

جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو پہلی رات کو جُمّن کی زبان سے موت کے آسان نسخوں کا ذکر سن کر پٹاخ سے پلنگ کی پٹی پر گری تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی ۔ پھر اس کی بتیسی کھولنے کے لئے کتنے ہی چمچے ٹیڑھے ہو گئے تھے اور سامنے کا ایک دانت تک ٹوٹ گیا تھا ۔ پر صبح کی اذان تک وہ یوں پڑی رہی تھی جیسے اُسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے ۔

اور پھر جانے کیا ہوّا کہ ہوش آنے کے بعد اس نے پہلی بات یہ کی "اہاہا ۔ ابلی ہوئی آنکھیں دیکھنے کو میرا کیسا کیسا جی چاہتا رے جُمّن ۔ ابلنے کے بعد یہ آنکھیں منہ پر لٹکتی رہتی ہیں کہ نیچے گر پڑتی ہیں رے جُمّن؟ آنکھوں کے ٹوٹنے کی آواز بھی تو آتی ہو گی رے جُمّن؟ یہ تماشہ مجھے کب دکھاؤ گے رے جُمّن؟"

"پاگل ہو گئی" کسی نے کہہ دیا "دماغ چل گیا دُلہن کا ۔"

لیکن دُلہن کا دماغ نہیں چلا تھا۔ بس اتنا ہوا کہ اسے ایک دم موت سے پیار ہوگیا اور وہ بھی بھدّی گندی لہولہان موت سے۔ جب کبھی سنتی کہ شہر میں کوئی بخار سے مرگیا ہے تو اُداس سی ہوجاتی اور کہتی "یہ موت بھی کوئی موت ہے کہ لیٹے لیٹے جان نکل گئی۔ ٹھاٹ سے مرنا تھا تو کوئی قتل وتل کرکے جُمّے کے ہاتھوں پھانسی پاتا۔ زبان تو نکلتی۔ گردن تو کھنچتی۔ خون تو پھوٹتا۔ بڑی پھُسپھُسی موت ملی بدنصیب کو۔"

شروع شروع میں تو اس کی باتوں سے محلے میں کافی بے چینی پھیل گئی مگر بعد میں فیصلہ ہوا کہ وہ معذور ہے۔

وہ اپنے بیٹے نتھو تک کو لاشوں کی کہانیاں سناتی اور نتھو نیند میں بھڑک کر اٹھ بیٹھتا اور چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیتا تو وہ فقیروں جوگیوں کے پاس ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے لینے چلی جاتی، دراصل اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر پھانسی اور پھانسی پانے والوں کا ذکر سن کر بچے بوڑھے بوکھلا کیوں جاتے ہیں۔ یوں وہ اپنی معذوری کا اقبال کرلیتی تھی، اور اس کی یہ معذوری آج جُمّے کے مرجانے کے بعد تک قائم تھی۔ اس نے کہا تھا "جس نے ایک نہ دو پورے نوکم دو سو جوانوں کو پھانسی پر لٹکایا وہ خود یہاں کھاٹ پر پڑا ایڑیاں رگڑتا رہا۔ ہنر والے یوں ہی مرتے ہیں بےچارے۔"

نتھو کے بیٹے خیرو کو بھی اب وہ ایسی ہی کہانیاں سناتی تھی "ایک دفعہ کا ذکر ہے بیٹا کہ تیرے دادا نے ایک نوجوان کو پھانسی پر لٹکایا۔ اس جوان نے ایک نہ دو اکٹھے پانچ قتل کئے تھے اور وہ بھی بندوق وندوق سے نہیں چھرے سے، چھ فٹ کا جوان تھا، اور جب اس کے قدموں تلے سے تختے ہٹے ہیں تو جانتے ہو کیا ہوا؟"

"مرگیا" خیرو کہتا۔

"ہاں ہاں مرتو گیا" وہ کہتی "سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کیسے مرا۔ جھٹکا لگا تو گردن دھڑ کا بوجھ نہ سہار سکی۔ تڑ سے ٹوٹ گئی اور اس کا سر اور دھڑ دونوں تمہارے دادا کے قدموں میں آرہے۔" وہ ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگتی۔ اور نتھو کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا کہ خیرو اپنی دادی کا ساتھ دے رہا ہے۔ "ہاہا" خیرو کہتا "کیسا مزا آیا ہوگا۔ کیوں دادی؟"

"کیوں بابا ؟" خیرو نتھو کو پکارتا۔ اور نتھو کہتا۔ "میں بچہ نہیں ہوں کہ مجھے کہانیوں کا مزا آئے۔ مجھے نہ پکارو، مجھے نیند آئی ہے!"

"اس کا، تیرے بابا کا تو اتنا ذرا سا خشخاش کے دانے کا سا دل ہے۔" نتھو کی ماں خیرو سے کہتی۔ "جانے یہ کیسے دے گا پھانسیاں۔"

ویسے نتھو نے اپنے والدین سے بگڑی ہوئی لاشوں کی اتنی کہانیاں سنی تھیں کہ اسے موت سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ لیکن آج جب وہ دایہ کو لے کر آیا تھا اور باپ کے چہرے کے سیاہ رنگ میں موت کی زرد ویرانی دیکھی تھی تو وہ سہم گیا تھا۔ اور جب اس کی ماں نے لاش کی مونچھوں کو بل دیا تھا تو نتھو کو جھرجھری آگئی تھی۔ مگر باپ دادا کا پیشہ یہی تھا اس لئے فوراً جاکر باپ کی موت کی رپورٹ کی اور خاندانی خدمات کے مدِنظر اسے باپ کی جانشینی کا شرف بخش دیا گیا۔ افسر مہربان تھے پھانسیوں کی تاریخ ملتوی بھی ہو سکتی تھی سو فیصلہ ہوا کہ اسے کسی دوسرے صوبے میں تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا جائے۔

پھر جب نتھو گھر واپس آیا تو اس کی بیوی کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں سارا محلہ جمع تھا اور گلی میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی، سب لوگ نتھو کو دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔ صرف چپ کھڑا ہوا خیرو راستے میں حائل تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر نتھو نے پوچھا "کیا ہوا تمہاری ماں کو؟"

"بچہ دیا ہے۔ درد ہو رہا ہے۔" خیرو بولا

نتھو جیسے ایک دھکا سا کھا کر کوٹھے کے اندر جا پڑا اور خیرو کی اس بات پر سارے مجمعے میں ایک سرگوشی سرسراتی ہوئی دوڑ گئی۔

نتھو کی ماں اندر کوٹھے میں تھی۔ نتھو کو دیکھا تو اسے ایک کونے میں لے جاکر بولی۔

"مر رہی ہے۔ مرنے والے کا صبر پڑا ہے۔"

نتھو نے پلٹ کر بیوی کی طرف دیکھا اور اس کی خوفناک رنگت دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے ایک بار پھر اپنے باپ کے مردے کو دیکھ لیا ہے، اور اس کا اندازہ سچ نکلا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد اس کی بیوی مر گئی۔ اور پھر تھوڑی سی دیر کے بعد اٹھ بھی گئی اور خالی ڈھنڈار گھر میں ایک دن کی بچی بلکتی اور ہاتھ پاؤں مارتی رہ گئی۔ اس روز نتھو کو اپنے گھر ہی سے خوف آنے لگا تھا۔ اور وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ کبھی اس کے کانوں میں مرتی ہوئی

بیوی کی چیخیں گونجتیں اور کبھی اس کی آنکھوں میں مرے ہوئے باپ کی مونچھیں بل کھا جاتیں اور وہ خشک ہونٹوں پر خشک زبان پھیر کر رہ جاتا۔

دوسرے ہی دن وہ جیسے اپنے گھر سے بھاگ گیا۔ اور اپنے پیشے کی تربیت حاصل کرنے دوسرے صوبے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو لوگوں نے یوں سمجھا جیسے اسے شدید قسم کا یرقان ہوگیا ہے۔ اس کے چہرے کی زردی میں کہیں کہیں نیلے نشان بھی اُبھر آئے تھے، اس کی آنکھیں کچھ ایسی خالی خالی ہوگئی تھیں جیسے ان میں سے بینائی چھلک پڑی ہے۔ چہرے پر جا بجا ایسی شکنیں ابھر آئی تھیں جیسے وہ موت کے کرب میں گرفتار ہے، ہونٹ مستقل طور پر خشک ہو کر پھٹ گئے تھے اور ہاتھوں کی انگلیوں میں رعشہ تھا۔ ماں نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ سینے سے لگا کر اسے خاندانی روایات یاد دلائیں اور غیرت دلائی۔ "مرے ہوؤں کی روحیں دیکھیں گی رے نتھو کہ تو جوانوں کو کیسے پھانسی دیتا ہے!" اس نے فریاد کی تھی اور نتھو نے عجیب غیر قدرتی، پھٹی پھٹی اور گونجتی ہوئی آواز میں ماں کو یقین دلایا تھا کہ وہ قاتلوں کی زندگی کو موت میں یوں بدلے گا جیسے بجلی کے جھکے ہوئے بٹن کو اٹھا دیا جائے ——— تڑک اور قصہ ختم! ——— "پر ماں ——— جب تختہ ہٹتا ہے نا اور جوان لٹکتا ہے نا تو یہاں سینے میں کچھ ٹوٹنے لگتا ہے اور دم گھٹنے لگتا ہے، پر خیر۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ دو گھونٹ پانی پی کر ٹھیک ہو جاتا ہوں"

اور جس روز نتھو نے اپنے صوبے میں پہلی پھانسی دی تو دیکھنے والے اس کے ہاتھ کی صفائی کے معترف ہوگئے۔ تختے کے گرتے ہی لٹکنے والے کو پاؤں سے پکڑ کر اس نے ذرا سا جھٹکا دیا۔ اور چھوڑ دیا تو کچھ ایسا لگا جیسے لٹکنے والا صدیوں سے لٹک رہا ہے۔ لیکن جب لاش کے اٹھنے کا وقت آیا تو نتھو آگے بڑھا۔ گلاب کا ایک پھول لاش کے چہرے کے پاس گاڑھے کی چادر پر رکھ دیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جھکائے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مجھے معاف کر دینا دوست۔"

حاضرین اس کی اس حرکت سے کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے تھے۔ جیسے انہوں نے لاش کو حرکت کرتے دیکھ لیا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی مگر فوراً ہی دب گئی۔ ہیڈ وارڈر

نے اسے الگ لے جا کر سمجھایا تھا کہ آخر تمہیں مرنے والے سے کیا۔ اس نے ایک آدمی کو مارا۔ قانون نے اسے مار ڈالا۔ اور نتھو نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے۔ پر اس نے تو مجھے اپنی جان دے دی۔ میں اسے ایک ذرا سا پھول بھی نہ دوں؟" ——— اور ہیڈ وارڈر جیسے لاجواب ہو کر پگڑی کے نیچے ایک انگلی لے جا کر سر کھجانے لگا تھا۔

چند ہی دوروں میں نتھو کے کمال کی دھاک بندھ گئی۔ لیکن لاش کو گلاب کا پھول پیش کرنے اور ڈبڈبائی آنکھیں جھکائے جوڑ کر "مجھے معاف کر دینا دوست" کہنے کی عادت میں فرق نہ آیا۔ مہینوں بعد جب نتھو کی ماں کو اس بات کا علم ہوا تو کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا رے نتھو۔"

اس کی ماں کی سمجھ میں تو یہ بات بھی نہ آتی تھی کہ نتھو کا رنگ کیوں فق رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت ڈری ڈری سی کیوں رہتی ہیں، اور جس روز وہ دورے سے واپس آتا ہے تو صحن کے ایک کونے میں چپ چاپ کیوں بیٹھ جاتا ہے اور رات بھر ٹہلتا کیوں رہتا ہے۔ "نتھو رے" وہ فریاد کرتی۔ "یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو کدھر جا رہا ہے رے نتھو ہے ———" اور نتھو جواب میں مسکرا دیتا۔ لیکن یہ مسکراہٹ مردے کی مسکراہٹ سے مشابہ ہوتی جس کے ہونٹ اکڑ کر اس کے دانتوں پر سے ہٹ گئے ہوں!

پھر وہ سوچتی کہ شاید وہ اپنی بچی کی مسلسل بیماری سے پریشان رہتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اپنی ماں کو مار کر یہ لڑکی اب باپ کو مار ڈالنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ چار سال کی ہونے کو آئی تھی مگر ایک برس کے بچے کی سی غوں غاں کے سوا اسے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ بڑی بہن کے بستر پر دن بھر یوں دم سادھے پڑی رہتی جیسے حرکت کرے گی تو ٹوٹ جائے گی۔ ہاتھ بھر کی اس بچی کی آنکھوں میں جیسے پھانسی پر لٹکتی ہوئی کتنی لاشوں کا آسیب گھس گیا تھا۔ نتھو اسے دیکھتا تھا تو رو دیتا تھا اور نتھو کی ماں کہتی تھی۔ "تو نہیں جانتا رے نتھو۔ اس پر بھی تو اپنے دادا کا صبر پڑا ہے۔"

وہ اپنے بیٹے کے کارناموں کا باقاعدہ حساب رکھتی تھی اور جس دن نتھو دورے سے واپس آتا تو سب سے پہلا سوال یہ پوچھتی۔ "کتنے؟"

"چار" وہ حسبِ عادت آہستہ سے کہتا اور اس کی ماں دیوار پر چار اور نشان اُبھار دیتی۔
اور یہ کوئی دس برس بعد کی بات ہے، جب ایک روز وہ دورے سے واپس آیا اور اس نے ماں کے سوال کے جواب میں "پانچ" کہا تو ماں نے مارے خوشی کے تالی بجا دی اور بیٹے سے لپٹ کر بولی "تو تو دس ہی سال میں اپنے باپ سے بھی بڑھ گیا رے نتھو۔ واہ رے نتھوا!"

"خیرو کہاں ہے؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پُوچھا۔
ماں بولی "صبح کو گیا تھا اب تک نہیں آیا۔ کھانا رکھے رکھے ٹھنڈا ہو گیا۔"
"وہ تو روز ٹھنڈا ہوتا تھا" نتھو کی بڑی بیٹی نے کہا "مگر آج تو بھیا کوٹ کی جیب میں کمانی والا چاقو بھی لے گیا ہے۔"
"ہاں۔ میں نے بھی دیکھا تھا" دوسری بولی۔
"میں نے پوچھا بھی تھا" تیسری نے کہا "پر وہ خفا ہو کر بولا۔ پھر پوچھے گی تو پیٹ پھاڑ ڈالوں گا۔"

نتھو کچھ دیر تک اپنے جُوتے کی نوک سے زمین کریدتا رہا۔ پھر بیٹیوں سے گڑگڑی لانے کو کہا اور صحن کے کونے میں جا کر ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا مگر انداز کچھ ایسے تھے کہ اگر نہ بیٹھتا تو گر جاتا۔
گڑگڑی اس کے پاس لائی گئی تو وہ اچانک جیسے بھڑک کر اٹھا اور چولھے کے قریب بیٹھی ماں کے پاس آ کر بولا "ماں۔ یہ خیرو پر آخر کس کا صبر پڑا ہے؟"
"کیوں رے نتھو؟" وہ حیران ہو کر بولی "اس پر کیوں کسی کا صبر پڑے؟ ایسا سجیلا جوان ہے اور پھر ٹھاٹ باٹھ ایسے ہیں کہ محلّے کا بادشاہ لگتا ہے، جس گلی میں سے گزرتا ہے ساری گلی مسکراتی نظر آتی ہے۔ گھر آنے میں دیر لگاتا ہے تو کیا ہوا؟ دوستوں یاروں والا ہے، جوانی کا زمانہ ہے جہاں بیٹھے ہیں بس بیٹھے ہیں۔ یہ تو نے کسی کے صبر پڑنے کی بھی ایک ہی کہی رے نتھو۔"

نتھو گڑگڑی لئے واپس آ رہا تھا تو اچانک خیرو گھر میں داخل ہوا اور باپ کو دیکھ کر ذرا سا ٹھٹکا۔ پھر آگے بڑھنے لگا تو نتھو بولا "ادھر آؤ خیرو۔ ایک بات سنو۔"

ننھو جاکر کھاٹ پر بیٹھ گیا اور جب خیرو اس کے سامنے آکر رُکا تو ننھو بولا "یہ دُنیا دو دن کا میلہ ہے لڑکے۔ تو گلیوں بازاروں میں نئے نئے کپڑے کھڑکھڑاتا پھرتا ہے، تو بالوں میں خوشبودار تیل لگاتا ہے۔ تیری مونچھوں کے بل بڑھ رہے ہیں۔ تو دن بھر اور آدھی رات تک گھر میں پاؤں نہیں رکھتا۔ اور تیری بہنیں تیرا راستہ تکتے تکتے سو جاتی ہیں، پر یاد رکھ لڑکے، یہ دُنیا دو دن کا میلہ ہے، تختہ ہٹتا ہے اور پو پھٹے رات آجاتی ہے۔ مٹ کے رہنا سیکھ خیرو۔ اکڑی گردن کو بھی موت کے دروازے میں سے جُھک کے گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے ان آنکھوں سے بڑے بڑے پہلوانوں کو دیکھا ہے کہ پھانسی کے احاطے تک نعرے مارتے آئے اور پھانسی کو دُور سے دیکھا تو ستی گم ہوگئی اور احاطے کے دروازے پر ہی ڈھیر ہوگئے۔ سنا؟"

خیرو نظریں جھکائے سُنتا رہا اور جب وہاں سے ہٹا تو باہر اس کے دوست اس کے منتظر کھڑے تھے۔ وہ گیا اور آدھی رات کو واپس آیا۔ اور ننھو خاموش رہا۔

خیرو جوا کھیلتا۔ چکلے جاتا، شراب پیتا اور گلے میں چنبیلی کے پھولوں کا ہار ڈال کر اور کانوں میں عطر کی پھریریاں سجا کر راتوں کو سینماؤں کے آس پاس لڑکھڑاتا اور گاتا پھرتا رہتا۔ ننھو کو یہ سب کچھ معلوم تھا مگر وہ آتے دن دورے پر رہتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو پہلے سے زیادہ زرد اور خاموش ہوتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اسے کسی نے اُونچی آواز میں بات کرتے نہیں سُنا تھا۔ اور اب تو دھیمے لہجے میں بولنے کی اسے عادت ہوگئی تھی اس لئے خیرو کو ڈانٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ گڑگڑی سلگاتا اور پھر اس کے ٹھنڈے ہونے کے بعد بھی اسے گڑگڑاتا رہتا۔ اب ہر کش کے ساتھ اسے کھانسی بھی آتی تھی لیکن کھانستے وقت بھی اس کے چہرے پر سرخی نہ جھلک پاتی۔ اس کے ہاتھ اور گھٹنے کانپنے لگتے۔ ہونٹ نیلے ہوجاتے اور آنکھوں سے پانی بہ نکلتا اور وہ پھر ٹھنڈی گڑگڑی کے کش لگانے لگتا۔

ایک دن اس کی ماں اس سے کھانسی کی وجہ پوچھنے آئی تو اس کی کھانسی کے جواب میں خود بھی کھانستی ہوئی بولی۔ "تجھے تو قاتلوں کی لاشیں کھا گئیں رے ننھو۔ ایک وہ تیرا باپ تھا کہ پھانسی دے کر آتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے دارو پی لی ہے اور تو ہے کہ ہر لاش تیرا آدھا

خون نچوڑ لے جاتی ہے۔ تیرے گھرانے میں تو بڑے بڑے ساونت گزرے ہیں رے نتھو۔ تیرا دادا مرا ہے تو اس کے مُردے کو آٹھ آدمیوں نے کندھا دیا تھا۔ پہلے چار نے اٹھانا چاہا تو اٹھاتے ہی رہ گئے رے نتھو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا رے نتھو۔"

نتھو نے ماں سے کچھ کہنا چاہا کہ اچانک خیرو بھاگتا اور ہانپتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور قمیض تو خون سے لت پت ہو رہی تھی۔ وہ نتھو کی طرف جیسے پناہ لینے کے لئے بڑھا مگر گلی میں سے بھاگتے ہوئے ہجوم کا شور اُٹھا اور خیرو نے فوراً خون آلود قمیص اتار کر چھت پر پھینک دی۔ اور پھر شور مچاتے ہوئے لوگوں کا ایک انبوہ صحن میں امڈ پڑا۔ خیرو نے فوراً اُڑسے ہوئے شلوار کے نیفے میں سے چاقو نکال لیا۔ اور ہجوم کے قدموں میں جیسے بیڑیاں پڑ گئیں، نتھو کی ماں جہاں بیٹھی تھی بیٹھی رہ گئی۔ اس کی بیٹیاں کوٹھے کے دروازے میں کھڑی آنکھیں پھاڑے بھائی کو گھورے جا رہی تھیں۔ مگر نتھو آہستہ سے اُٹھا خیرو کے پاس آیا اور اپنے دھیمے لہجے میں بولا "چاقو پھینک دے لڑکے۔"

خیرو نے فوراً چاقو پھینک دیا۔ نتھو اس سے کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ پولیس والے آتے اور خیرو کے ہتھکڑی لگا دی۔ ایک آدمی چھت پر چڑھ کر اس کی قمیض بھی اتار لایا اور جب وُہ خیرو کو لے جانے لگے، تو نتھو پولیس والوں کے سامنے آ گیا اور آہستہ سے بولا "میں اُس لڑکے کا باپ ہوں۔"

"تم ایک قاتل کے باپ ہو" پولیس والے نے کہا "تمہارے بیٹے نے ابھی ابھی اپنے ایک دوست کو چھُرا مار کر ختم کر دیا ہے۔ لاش اب تک سڑک پر پڑی ہے۔ یہ جوئے میں ہارا تھا اور وہ جیتا تھا۔ تھانے میں چشم دید گواہوں کی ایک قطار بیٹھی ہے۔ دن دہاڑے چلتی سڑک پر چیر پھاڑ کر رکھ دیا اُسے ——— چلو!" انہوں نے خیرو کی ہتھکڑیاں کھینچیں اور آن کی آن میں نتھو کے گھر میں اُلّو بولنے لگا۔ خیرو کی بہنیں اپنے بھائی کے پیچھے روتی پیٹتی چلی گئیں۔ صرف سب سے چھوٹی بہن اپنی موٹی موٹی گول گول آسیبی آنکھوں سے دروازے کو گھورتی رہ گئی۔ نتھو کی ماں ایک ہاتھ سے لاٹھی ٹیکتی اور دوسرے ہاتھ کو جھکی ہوئی کمر پر رکھے گلی کے سرے تک یوں لپکی چلی گئی جیسے خیرو کی ہتھکڑیاں کاٹ کر ہی واپس آئے گی اور

ننھو نے کھاٹ پر بیٹھ کر گڑگڑی اٹھالی۔ ایک ہی کش لگا کر اُسے اُلٹ دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور جب اس کی حواس باختہ ماں دروازے پر نمودار ہوئی اور اس کی تینوں بیٹیاں بال نوچتی سینہ پیٹتی چیختی چلاتی صحن میں داخل ہوئیں اور ننھو سے لپٹ لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگیں تو ننھو نے دھیمے لہجے سے کہا "روؤ نہیں لڑکیو۔ اب نہ روؤ۔ اس وقت رو لینا جب تمہارے بھائی کو تمہارا باپ پھانسی پر لٹکائے گا" پھر وہ ماں سے مخاطب ہوا "کیوں ماں۔ مزا آئے گا نا اس پھانسی کا؟" اور بڑھیا پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

تینوں لڑکیاں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رو پڑی تھیں اور چہروں کو ہاتھوں میں چھپا کر کوٹھے میں گھس گئی تھیں۔ ننھو نے اب ماں کی طرف دیکھا جو زمین پر سے مٹی اٹھا اٹھا کر اپنے سفید چونڈے میں ڈال رہی تھی اور جیسے بین کر رہی تھی "یہ کیا ہو گیا رے ننھو، اب کیا ہو گا رے ننھو، ہائے رے ننھو" ——— اور ننھو آہستہ آہستہ چلتا ہوا گلی میں آ گیا تھا۔

خیرد کا مقدمہ جب سیشن سپرد ہو گیا۔ اور ننھو کو آثار بُرے نظر آنے لگے تو وہ اپنے بڑے افسر کے پاس پہنچا اور استعفا پیش کر دیا۔ درخواست میں اس نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگرچہ اس مُلازمت کے لئے بہت کم لوگ تیار ہوتے ہیں مگر اس نے ایک شخص کو مجبور کر لیا ہے" اور اس نے ہاتھ باندھ کر کہا تھا "سرکار کا کام بالکل نہیں رُکے گا۔ بس حضور کا خادم یہ نہیں چاہتا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے پھانسی دے۔ اور پھر حضور! جب میرے بیٹے کو پھانسی دے دی گئی تو میں کیا خاک پھانسیاں دوں گا" اور وہ ٹوٹ کر رو دیا تھا۔

بہت دِنوں کے بعد استعفا منظور ہو گیا۔ مگر طے پایا کہ ننھو نووارد راجو کو تربیت دے اور کم از کم تین ابتدائی پھانسیوں کے موقعے پر حاضر رہے۔

اور اس فیصلے کے ساتھ ہی دوسرا فیصلہ بھی ہو گیا۔ خیرو کو ہائی کورٹ نے پھانسی کی سزا سنا دی اور نووارد راجو کی تین ابتدائی پھانسیوں میں سے سب سے پہلے پھانسی خیرو کی تھی۔

شام سے پہلے ننھو اپنی چاروں بیٹیوں اور بوڑھی ماں کے ساتھ خیرو سے آخری ملاقات کو گیا۔ سب پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے، مگر ننھو ایک پھانسی لگی لاش کی طرح کھڑا خیرد کو ٹکٹکی

باندھے دیکھتا رہا۔ خیرو آج ہو بہو نتھو ہو رہا تھا۔ وہی زرد یرقانی رنگ ـــــــ وہی ڈر سے بھری ہوئی آنکھیں، وہی رعشہ اور کپکپی! ـــــــ اور جب سب واپس آنے لگے تھے تو خیرو نے اپنے باپ سے صرف اتنا کہا تھا "مجھے معاف کر دینا بابا۔ کل صبح کو تم سے تو پھر بھی ملاقات ہو گی۔" نتھو کچھ نہیں بولا۔ چپکے سے پلٹ گیا۔ مگر جب خیرو نے دادی سے کہا "میری موت نوجوان مردوں کی موت ہے اماں!" تو بڑھیا لاٹھی پھینک کر گر پڑی تھی اور زور زور سے روتے ہوئے اپنا سر زمین پر پٹخنے لگی تھی۔ اور نتھو نے بھاگ کر اُسے ایک بچّے کی طرح اٹھا لیا تھا اور واپس چلا آیا تھا۔

رات نتھو کی بیٹیاں مسلسل روتی رہیں، اور نتھو کی ماں بین کرتی رہی، لیکن ایک موہوم سی اُمید نے انہیں بلند آواز سے رونے یا بین کرنے سے روکے رکھا۔ البتہ جب نتھو ڈیوٹی پر جانے کے لئے اٹھا تو ایک کہرام سا مچ گیا۔ نتھو اپنی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی ہوئی بیٹیوں کو ہولے ہولے جھٹکتا جب دروازے تک آیا تو بڑھیا بولی "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا رے نتھو۔ ہائے رے نتھو ـــــــ" اور نتھو کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔

خیرو کو جب پھانسی کے احاطے میں لایا گیا تو اسے دو وارڈروں نے تھام رکھا تھا۔ اس کے پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے اور اس کی آنکھیں اُوپر چڑھ گئی تھیں۔ نتھو اسی قطار میں ذرا الگ ہٹ کر کھڑا تھا۔ جس میں مجسٹریٹ، سپرنٹنڈنٹ جیل اور ڈاکٹر کھڑے تھے، مگر اس نے خیرو کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پھانسی کے وقت جیل پر ویسے ہی سناٹا چھا جاتا ہے مگر آج تو سب لوگ جیسے بت بن کر رہ گئے تھے۔ صرف اتنا ہوا کہ جب خیرو احاطے میں داخل ہوا تو سب نے پلٹ کر ایک بار نتھو کو دیکھا جو ہاتھ باندھے، آنکھیں جھکائے جیسے اپنے ہی قدموں کو گھورے جا رہا تھا۔

راجو کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ ڈرتا ڈرتا نتھو کے قریب آیا اور جیسے سرگوشی میں بولا "چاچا"

اور نتھو ایک دم چلّا اُٹھا "پہلے سب بتا تو دیا تھا!"

سناٹے نے آواز کی شدت کو دگنا کر دیا۔ سب نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور

جھینپتا ہوا راجو پھانسی کی طرف بڑھا۔

"پہلے سب بتا تو دیا تھا راجو" اب کے نتھو نے بڑی نرمی سے کہا، اور کچھ یوں جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ "جا"

خیرو کو ٹوپی پہنا دی گئی تھی اور وہ تختوں پر پہنچا دیا گیا تھا۔

نتھو بدستور زمین کو گھورتا رہا۔

رسّی کا پھندا خیرو کے گلے میں ڈال دیا گیا اور سپاہی ہٹ آتے مگر خیرو کچھ یوں بے جان ہو کر لٹک سا گیا جیسے پھانسی پانے سے پہلے پھانسی پا گیا ہے۔

اور پھر تختے اپنی مخصوص تالی بجا کر ہٹے اور نتھو کی آنکھیں جو اپنی اصلی جسامت سے دگنی ہو گئی تھیں۔ اچانک پھانسی کی طرف اٹھیں۔

خیرو زخمی کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔

"او راجو" احاطے میں نتھو کی آواز گونجی۔ "ادھر آ مزا دے" وہ پھانسی کی طرف پوری تیزی سے بھاگا۔ "ارے ایسے پیارے جوان کو کیا یوں ہی پھانسی دی جاتی ہے او الو کے پٹھے!" —— وہ پھانسی والے گڑھے میں اتر گیا۔

خیرو بدستور پھڑک رہا تھا۔

نتھو نے ایک ہاتھ بلند کر کے خیرو کو پاؤں سے پکڑ کر ایک جھٹکا سا دیا اور پھر بولا "یوں آرام سے مارتے ہیں جوانوں کو۔"

خیرو کی لاش رسّی سے یوں لٹک رہی تھی جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے۔

اور جب خیرو کی لاش کو سٹریچر پر رکھا گیا تو نتھو اپنے پاؤں گھسیٹتا ہوا آیا۔ بیٹے کی لاش کے پاس ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "جلدی میں کوئی پھول نہیں مل سکا —— مجھے معاف کر دینا دوست!"

وہ دھپ سے سٹریچر کے قریب گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔

زلیخا

درختوں کی شاخیں رات کی خنکی میں ٹھٹھر کر رہ گئی ہیں۔ ہوا چلتی تو شاید ان کی رگوں میں اتری ہوئی برف جھڑ جاتی مگر ہوا بھی جیسے درختوں کے اس جھنڈ میں کہیں ٹھٹھری پڑی ہے۔ چاندنی میں کفن کی سی سفیدی ہے۔ فراخ اور ہموار لان پر ایک بلّی دبے پاؤں بھاگی جا رہی ہے۔ وہ لان کے قوسی حاشیے پر اُگے ہوئے پھولوں میں ٹھٹک کر رہ جاتی ہے اور اپنا ایک اگلا پنجہ اٹھا کر دم کو یوں حرکت دیتی ہے جیسے جادو کر رہی ہے۔ پھر وُہ پھولوں پر سے کود کر کوٹھی کے برآمدے میں پام کے گملوں کے درمیان دبک کر بیٹھ جاتی ہے اور نوکروں کے کوارٹروں کی طرف سے خوف اور دکھ سے لدی ہوئی ایک چیخ بلند ہوتی ہے۔

"یہ زلیخا کی چیخ ہے۔" ڈرائینگ رُوم میں انور صوفے پر سے اُٹھ کر کہتا ہے۔ "زلیخا ہماری نوکرانی ہے۔"

"مگر زلیخا چیخ کیوں رہی ہے؟" سجاد پائپ کو دانتوں میں دبا کر پوچھتا ہے۔

"جن آتے ہوں گے۔" فدا سگار کو ایش ٹرے میں سے اُٹھا کر کہتا ہے۔ "جاہل عورتوں کے دو ہی تو کام ہیں یا ان پر جن آتے رہتے ہیں یا وہ بچے پیدا کرتی رہتی ہیں۔"

"بچہ ہی پیدا ہو رہا ہے۔" انور مسکرا کر کہتا ہے اور صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیتا ہے۔

بلّی پام کے گملوں میں سے نکل کر برآمدے میں ٹہلنے لگی ہے۔ برآمدے میں بجلی کی روشنی ہے بلّی کا سایہ لمبا اور بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ بلّی سیمنٹ کے چمکتے ہوئے فرش کو

سونگھتی جا رہی ہے۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنے سایہ کو سونگھ رہی ہے اور سایہ اسے سونگھ لیتا ہے۔ وہ برآمدے کے پرلے سرے پر جا کر بیٹھ جاتی ہے اور کھلونا سا بن جاتی ہے وہ سڑک کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سڑک سو رہی ہے۔ سڑک کے اس پار ایک کھڑکی کے شیشے چمک رہے ہیں۔ پھر ان شیشوں پر سے ایک سایہ گزرتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سایہ اوپر آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کے سامنے سے بھی گزر گیا۔ بلی کود کر نیچے آجاتی ہے۔ سڑک پر سے ایک موٹر گزر جاتی ہے۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک پرندہ پھڑپھڑاتا ہے۔ پھر بہت سے پرندے پھڑپھڑاتے ہیں۔ سڑک کے اس پار کھڑکی کے شیشے بجھ جاتے ہیں اور زلیخا زور سے چیختی ہے۔

"چھوٹے صاحب جی"۔ برکت ڈرائینگ روم کے بند دروازے کے قریب آ کر پکارتا ہے۔

"یہ زلیخا کا شوہر ہے"۔ انور دونوں دوستوں کو اطلاع دیتا ہے اور پھر کہتا ہے۔ "آجاؤ برکت"۔

برکت یوں اندر آتا ہے جیسے یہ انور کا ڈرائینگ روم نہیں۔ مدرسہ ہے اور وہ پہلی جماعت میں داخلہ لینے آیا ہے۔ وہ ٹھٹھرا اور سمٹا جا رہا ہے اور اس کی مونچھیں اس کی باچھوں کے پاس قوسین کے سے خم کھا کر لٹک رہی ہیں۔ وہ کچھ یوں نچڑا ہوا سا ہے جیسے اس کے جسم میں بالشت بھر سوا بھی اتار دیا جائے تو اس میں سے خون کی جگہ میلا کچیلا کچا کچا پانی رسنے لگے۔

"یہ برکت ہے"۔ انور تفصیل سے برکت کا تعارف کراتا ہے۔ "اسے شادی کئے چار سال ہونے کو آئے ہیں اور اس نے ان چار برسوں میں کوئی چار سیر فولاد، کشتۂ فولاد کی صورت میں، کھا لیا ہوگا"۔

برکت شرماتا ہے سجاد اور فدا اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ انور کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ وہ پھر بولنے لگتا ہے۔

"برکت آج بہت خوش ہے۔ چار برسوں کے بعد اس کی زلیخا کے ہاں بچّہ ہو رہا ہے۔
اسے یوں منحنی سا نہ دیکھو۔ اس کی ساری چربی لوہا بن کر اس کی ہڈیوں میں چلی گئی ہے۔"
تینوں دوست مسکراتے ہیں مگر برکت شرمایا اور گھبرایا ہوا ہے، وہ جیسے فریاد کرتا ہے۔
"چھوٹے صاحب جی۔ مس صاحب کہتی ہے کہ خطرہ ہے۔ اپریشن ہوگا۔"
"مس صاحب سے جا کر کہہ دو کہ" انور ڈبے میں سے ایک نیا سگریٹ نکالتے ہوئے
کہتا ہے۔" آپ کو صاحب ڈبل فیس دیں گے۔ سمجھے؟ کبھی کبھی ڈبل فیس اپریشن کے بغیر بھی
بچّہ پیدا کر لیتی ہے۔"

انور اور سجاد قہقہے مارنے لگتے ہیں۔ فدا مسکراتا ہے۔ اور برکت کی ساری شرم اور
گھبراہٹ غائب ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے "مس صاحب زلیخا کو بار بار ڈانٹتی ہے
چھوٹے صاحب جی۔ کہتی ہے تم چیخو مت۔ پہلا بچّہ تو حور کے ہاں بھی ہوگا تو ایسی ہی تکلیف
ہوگی۔ ایک بار زلیخا نے پوچھا کہ تمہارے بھی کبھی کوئی بچّہ ہوا ہے تو مس صاحب غصّے میں
آگئی۔ بولی۔ بیاہ سے پہلے بچّے تم کنگلوں کے ہاں ہوتے ہوں گے۔ ہم شریف لوگ ہیں۔
شریفوں کے ہاں صرف قانونی بچّے پیدا ہو سکتے ہیں۔" برکت زور سے ہنستا ہے مگر زلیخا کی
چیخ سُن کر ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے اور چلا آتا ہے۔
انور اور سجاد ہنس رہے ہیں اور فدا مسکرا رہا ہے۔

بلّی لان میں ٹہل رہی ہے۔ پھر اُسے اچانک چاندنی میں اپنے سائے سے کھیلنے کا
خیال آتا ہے اور وہ دُور تک اپنے سائے کو پکڑنے کی کوشش میں گرتی لوٹتی اور بھاگتی
چلی جاتی ہے۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے پہنچتی ہے تو خشک پتّے چیخنے لگتے ہیں اور وہ اپنے
سائے کو درختوں کے سایوں میں کھو بیٹھتی ہے۔ ہوا چلنے لگی ہے مگر کچھ ایسی نرم کہ صرف پتّے
ہلتے ہیں اور شاخیں دم بخود رہتی ہیں۔ شاخیں ٹھٹھر گئی ہیں اور پتّے لرز رہے ہیں۔ برکت
نوکروں کے کوارٹروں کی طرف سے بھاگا آ رہا ہے۔

"آج میں بہت خوش ہوں" انور کہتا ہے۔ "جانے آج میں کیوں خوش ہوں! مجھے ناچنا آتا تو آج رات بھر ناچتا رہتا۔ سجاد گا سکتا ہے مگر نخرے کر رہا ہے۔ اور فدا تم تو خیر ازلی بور ہو۔ تم سگاروں کے برانڈ سے اِدھر کی ہر بات کو فلسفہ کہہ کر ٹال دیتے ہو مگر تمہارا یہی احسان کیا کم ہے کہ میرے کہنے پر تم لوگ یہاں تو آ گئے۔ آج تم میرا کہا نہ مانتے تو خدا کی قسم میں پاگل ہو جاتا۔ تم پوچھو گے میں کیوں خوش ہوں اور میں ساری دُنیا سے پوچھتا ہوں کہ میں خوش ہوں"

"ساری دُنیا کی طرف سے میں تمہارے اس سوال کا جواب دیتا ہوں" سجاد پائپ کو دانتوں میں دبا کر کہتا ہے۔ "تم ہوائی قسم کے آدمی ہو، لطیفے ہو رہے ہوں تو تم یونانی المیئے کے نکتے لے بیٹھے ہو، کوئی مر رہا ہو تو تمہیں گپ شپ کی سُوجھتی ہے۔ تم دنیا کے عظیم ترین مس فٹ ہو۔ آج تمہاری نوکرانی موت کے منہ میں پڑی تڑپ رہی ہے مگر تم کہتے ہو کہ بینجو پر تمہیں فلمی غزلیں سناؤں اور یہیں اسی کمرے میں بیٹھ کر سناؤں جہاں روشندانوں میں سے زلیخا کی چیخیں برسی پڑ رہی ہیں"

"مجھے تو نیند آ رہی ہے بقراطو" فدا سگار کو ایش ٹرے میں رکھ کر کہتا ہے۔

"بھئی میں پوچھتا ہوں میں اتنا خوش کیوں ہوں!" انور بچّے کی سی سادگی سے پُوچھتا ہے۔

"چھوٹے صاحب جی" برکت دروازے پر سے کہتا ہے۔ "مُبارک ہو"

"ہو گیا؟" انور اُچھل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"جی نہیں" برکت باہر ہی سے جواب دیتا ہے "ہو رہا ہے۔ ہو جائے گا"

انور دوستوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے اور پھر برکت سے پوچھتا ہے "ڈبل فیس اپنا اثر دکھا رہی ہے نا؟"

برکت کوئی جواب نہیں دیتا۔

برکت واپس بھاگ گیا ہے۔ اور اس کی جگہ دروازے پر بلّی بیٹھی اپنا ایک پنجہ چاٹ رہی ہے۔

برکت ہاتھ میں شیشے کا ایک گلاس لئے کوارٹر میں سے نکلتا ہے اور لان کے حاشیے پر سے پھول توڑ توڑ کر اس میں سجاتا ہے۔ انور، سجاد اور فدا برآمدے میں آگئے ہیں۔ انور اور سجاد، برکت کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں مگر فدا نے بلّی کو ہاتھوں میں اٹھا لیا ہے۔ اور بجلی کے قمقمے کے نیچے رُک کر بلّی کو غور سے دیکھ رہا ہے اور بلّی اسے غور سے دیکھ رہی ہے۔ برکت گلاس میں بڑا سا گلدستہ سجاتے تیزی سے واپس جانے لگتا ہے مگر ٹھٹک جاتا ہے۔ "جاؤ۔ جاؤ" انور کہتا ہے برکت کوارٹروں کی طرف چلا جاتا ہے اور انور مسکرا کر سجاد سے کہتا ہے "ایک بچے کا باپ ہونے میں —— پہلے بچے کا باپ ہونے میں کتنا بڑا رومانس ہے سجاد۔ برکت ہوا میں اُڑا پھرتا ہے۔ زندگی میں شاید پہلی بار اس نے پھولوں کی چوری کی ہے۔ نہ جانے پیار اور محبت کی شدت میں پھول کیوں یاد آنے لگتے ہیں۔ برکت کو معلوم ہے کہ آبا جان پھولوں کو گن رکھتے ہیں۔ مگر اسے یہ بھی تو معلوم ہے کہ آبا جان ان دنوں یہاں نہیں ہیں۔ اور پھر اسے یہ بھی تو معلوم ہے کہ میں اسے پھول توڑنے سے نہیں روکوں گا۔ آسمان سے تارے توڑ لانا صرف ایک محاورہ ہے لیکن اگر برکت آج تارے توڑنے کا بھی خیال ظاہر کرے تو میں اس وقت تو اُسے اپنے کندھوں پر کھڑا کر لوں گا۔ اپنے سر پر کھڑا کر لوں گا۔ کیوں فدا —— تمہارا تو ایک بچہ ہے بھی —— بہت خوشی ہوتی ہے نا؟"

فدا جھک کر بلّی کو فرش پر رکھ دیتا ہے مگر بلّی بھاگ جانے کے بجائے اس کے پاؤں سے اپنا جسم رگڑنے لگتی ہے۔ فدا کہتا ہے "ہوتی ہے مگر خوشی کا یہ بھونڈا اظہار مجھے پسند نہیں کہ پھولوں کو پانی پینے کے گلاس میں سجایا جا رہا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے شراب حقّے میں پی جانے لگے۔"

فدا اور سجاد ہنستے ہیں مگر انور سنجیدہ ہو جاتا ہے "اس طبقے کا بھی تو خیال رکھو فدا جس سے برکت تعلق رکھتا ہے۔"

فدا کہتا ہے "اس بچے کا بھی تو خیال رکھو انور جو کسی طبقے سے تعلق نہیں رکھتا۔"

انور لاجواب نظر آنے لگتا ہے۔

سجاد کی کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے ایک لطیفہ انجام تک پہنچ کر المیہ بن گیا ہے۔
فدا نے بلّی کو پھر سے ہاتھوں پر اُٹھا لیا ہے۔
زلیخا معمول سے زیادہ شدت سے چیختی ہے اور انور تیزی سے ڈرائینگ روم میں چلا جاتا ہے۔

سجاد اور فدا برآمدے میں کھڑے کبھی بلّی اور کبھی چاند کو دیکھ رہے ہیں۔ چاند درختوں کے جھنڈ سے بلند ہو کر چمک رہا ہے۔ بلّی فدا کے ہاتھوں میں سو جانے کی سوچ رہی ہے۔
"یہ انور عجیب آدمی ہے۔" فدا کہتا ہے "آخری عُمر میں یہ پاگل ہو جائے گا یا اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہونے لگے گا۔"
"تم تو بے وقوف ہو فدا" سجاد متانت سے کہتا ہے "لطیف جذبات تو تمہیں چھو بھی نہیں گئے۔ ارے یہ انور نہ تو بے وقوف ہے نہ ولی اللہ ہے۔ یہ بس ایک سیدھا سادا شریف آدمی ہے۔ اور ایسے شریف لوگوں کو دُنیا یا تو خُدا مان لیتی ہے یا ان کے دُم لگا دیتی ہے۔"
"ارے میں بھی تو وہی کہہ رہا تھا بقراطِ زماں" فدا کہتا ہے "انور شریف آدمی ہے۔ ٹھیک ہے۔ مگر وہ اتنا شریف آدمی ہے کہ اگر سانپ اسے بجائے پنڈلی کے ٹخنے پر کاٹے گا تو اپنی زندگی کے بجائے اسے سانپ کے دانتوں کی فکر پڑ جائے گی۔"
"یہ تو خیر جہالت کی حد تک مبالغہ ہے" سجاد کہتا ہے۔
انور برآمدے میں داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے "فدا۔ میں برکت کو سنگِ سُرخ کے وہ دونوں گل دان دے آیا ہوں جو منٹل پیس پر رکھے تھے۔"
فدا زور کا قہقہہ لگاتا ہے۔
سجاد سوچنے لگتا ہے۔
انور بلّی کو فدا کے ہاتھوں سے چھین کر باہر پھینک دیتا ہے اور اسے کھینچتا ہوا ڈرائینگ روم میں لے جاتا ہے۔ سجاد اُن کے پیچھے ہے۔

۱

بلّی اُٹھ کر زلیخا کی چیخ سُنتی ہے اور پھر لان پر جا کر زبان سے اپنا جسم چاٹنے لگتی ہے۔

تیز ہوا سے ٹھٹھری ہوئی شاخوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں اور وہ ڈول رہی ہیں۔ پتّے اِدھر سے اُدھر اُڑتے ہوئے جیسے مسلسل بڑبڑا رہے ہیں۔ پھننگوں پر بیٹھے ہوئے پرندے ہوا میں اڑ کر بجلی کے تاروں میں ٹکرا گئے ہیں اور چیخ اُٹھے ہیں۔ ایک پرندہ سڑک پر گرتا ہے اور بلّی اس پر جھپٹتی ہے، مگر اُدھر سے ایک موٹر بلّی کا راستہ کاٹ جاتی ہے اور بلّی اِدھر اُدھر بھاگتے بھاگتے تھک کر برآمدے میں آجاتی ہے اور اپنا جسم چاٹنے لگتی ہے۔ برکت بھاگتا ہوا آتا ہے اور بلی پام کے گملوں میں دبک جاتی ہے۔

"چھوٹے صاحب جی" برکت اب کے اجازت کے بغیر دروازہ کھول کر اندر چلا آیا ہے۔

"کیا بات ہے؟" انور چونک کر پوچھتا ہے۔

"مس صاحب کہتی ہے زلیخا مشکل سے بچے گی۔"

"اور بچّہ؟" انور فوراً دوسرا سوال کرتا ہے۔

"وہ بچ جائے گا۔"

"بچتی ہے۔" انور اسے تسلی دیتا ہے۔ "بچّہ پیدا ہو گیا تو سمجھو زلیخا بھی نئے سرے سے پیدا ہو گئی۔"

"آپ کے منہ میں گھی شکر۔" برکت کہتا ہے اور واپس بھاگ جاتا ہے۔

تینوں دوست ہنسنے لگتے ہیں۔

ابھی یہ قہقہے رکنے نہیں پاتے کہ حواس باختہ برکت بے تحاشہ اندر چلا آتا ہے۔

"اپریشن ہو رہا ہے چھوٹے صاحب جی۔"

"ارے سب ٹھیک ہو جائے گا پگلے۔" انور کہتا ہے "گھبراتا کیوں ہے؟ یہ معمولی اپریشن ہوتا ہے اور اپریشن سے بچّہ بھی آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ چل۔"

برکت واپس جاتا ہے تو فدا کہتا ہے "تمہارے منہ میں گھی شکر"
تینوں پھر سے ہنسنے لگتے ہیں۔

بلّی ڈرائینگ روم کے دروازے کے پاس بیٹھی پچھلا پنجہ چاٹتی ہے اور پھر یہی پنجہ اپنے سر پر پھیرتی ہے۔ ایک پتہ اڑتا ہوا برآمدے میں آتا ہے۔ بلّی اس پر جھپٹتی ہے۔ اسے سونگھتی ہے اور پھر ہولے ہولے چلتی ہوئی واپس دروازے کے پاس آ کر یوں بیٹھتی ہے۔ جیسے گر پڑی ہے۔ وہ پھر سے پنجہ چاٹنے لگتی ہے۔ خشک پتہ برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اُتر کر غائب ہو جاتا ہے۔
زلیخا اس زور سے چیختی ہے اور اتنی دیر تک چیختی ہے جیسے یہ چیخیں قیامت تک نہیں رُکیں گی۔ جیسے ان چیخوں میں وحشت ہے۔ آسیب ہے۔ موت ہے۔

دھڑاک سے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھلتا ہے اور باہر لپکتا ہوا انور بلّی کو اپنے پاؤں سے کچل ڈالتا ہے۔ بلّی بلبلا اُٹھتی ہے۔ انور درد سے بل کھاتی اور روتی ہوئی بلّی کو غصے سے ٹھوکر مار کر برآمدے سے نیچے گرا دیتا ہے اور نوکروں کے کوارٹروں کی طرف بھاگتا ہے۔
سجاد بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کے پرلے سرے تک چلا جاتا ہے۔ اور فدا تیزی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے بڑے غصہ سے کہتا ہے "تمہیں شرم آنی چاہیئے انور۔ اس معصوم اور بے زبان نے آخر تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ" ——— وہ چُچ چُچ کرتے ہوئے مرتی ہوئی بلّی کو ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے۔ اسے بجلی کے قمقمے کے نیچے لاتا اور اس کی نیم وا آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے۔ بلّی نقاہت سے آنکھیں بند کر کے اکڑا اکڑ جاتی ہے۔ اور کچھ ایسی آواز نکالتی ہے۔ جیسے اب وہ کبھی نہیں بول سکے گی۔ لان میں بھاگتے ہوئے پتے بڑبڑاتے پھر رہے ہیں۔ پھننگوں کی شاخیں جیسے اچک اچک کر چاند کو پکڑنا چاہتی ہیں۔ اور سفید چاندنی میں چمکتے ہوئے پھول تڑپ رہے ہیں۔

سجاد دُور نوکروں کے کوارٹروں کے پاس انور کو کھڑا دیکھتا ہے۔ پھر وہ اسے پکارتا ہے۔ پھر تیزی سے اس کے پاس جاتا ہے۔ وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر برآمدے کی طرف گھسیٹے لا رہا ہے۔

برآمدے میں کھڑے ہوتے فدا کے ہاتھوں میں بلی ہے اور آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"سنو سجاد" انور ایک جگہ رُک کر بھرائی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہتا ہے۔ "فدا کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیئے کہ میں رو رہا ہُوں۔ وہ پیٹ کا ہلکا ہے۔"

سجاد جیسے انور کی آنکھوں میں جھانکتا ہے۔

"سنو سجاد" انور گھٹتے ہوتے گلے میں سے بمشکل آواز نکالتا ہے۔ "زلیخا نہیں مری۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" سجاد کہتا ہے۔ "پھر تم رو کیوں رہے ہو؟"

"سنو سجاد" انور کی آواز بالکل غیر قدرتی ہو جاتی ہے۔ "زلیخا نہیں مری۔ بچّہ مرا ہے۔"

انور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور برآمدے سے دُور چلا جاتا ہے۔ سجاد لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ "ٹھیک ہے۔ افسوس کی بات ہے۔ پر تم یوں پھُوٹ پھوٹ کر کیوں روئے جا رہے ہو بے وقوف؟"

"سنو سجاد۔" انور پٹے ہوتے بچّے کی طرح بلک بلک کر کہتا ہے۔ "یہ بچّہ جو مر گیا ہے نا یہ برکت کا نہیں تھا۔"

"تو پھر کس کا تھا۔" سجاد پوچھتا ہے۔

انور اپنا سَر سجاد کے کندھے پر رکھ کر کہتا ہے۔ "یہ صرف زلیخا جانتی ہے۔"

لان میں پتّے بڑبڑاتے ہیں اور ایک درخت کی پھننگ ماتمی انگلی کی طرح چاند پر سے بار بار گزر جاتی ہے۔

بدنام

"یہ کون ہے؟" میں نے پُوچھا
اور سب دوست میری طرف یوں دیکھنے لگے جیسے بیٹھے بٹھاتے ایک دم میرا دماغ چل گیا ہے۔
عورت مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پاس ذرا کی ذرا رُکی۔ ہاتھوں کی پوروں سے محراب کو چھوکر پوروں کو چُوما، انہیں آنکھوں پر رکھا اور بغل کی گلی میں لہراتی ہوئی مڑ گئی۔
"بھئی کون ہے یہ کافر؟" میں نے منہ اور آنکھیں پھاڑ کر دوستوں سے پُوچھا
سب ہنسنے لگے۔ اور پھر سعید بولا "نفرت ہوگئی تم سے اور تمہاری بی۔ اے سے۔ تمہارے عہدے پر تھوکنے کو جی چاہتا ہے کم بخت جاہل، بے وقوف۔ دو مہینے کی چھٹی میں اگر ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو خُدا کے لئے آج ہی واپس چلے جاؤ۔"
اور سب نے مل کر ایک ساتھ ایسا کڑکتا ہوا قہقہہ لگایا کہ گلی میں سے گزرتے ہوئے بوڑھے امام صاحب ہمیں گھورے بغیر نہ رہ سکے۔
سعید نے میرے سر پر ہلکی سی چپت ماری "اسے نہیں جانتے تو پھر کسے جانتے ہو؟ جناب عالی۔ یہ وہی تو ہے جس نے تمہاری بلوری گولیاں چرا کر نیفے میں اڑس لی تھیں اور جب تم اس پر جھپٹے تھے تو یہ ڈر کر بھاگی تھی اور کچھ گولیاں اس کی شلوار کے اندر سے ہوتی ہوئی پائینچے میں سے باہر لڑھک گئی تھیں۔ اور تم نے مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو کر کہا تھا "یہ گولیاں بھی لیتی جا سور کہیں کی۔ یہ تیری ہیں۔ سب گولیاں تیری ہیں۔

یاد ہے ؟"

"نوراں !" میں یوں بولا۔ جیسے پہیلی بوجھ لی ہے۔

اور وہ نوراں ہی تھی۔

مگر وہ نوراں تو نیا نیا چاند تھی۔ حیا سے سمٹی اور لچکی ہوئی۔ دبلی تیلی اور لوکدار۔ اور یہ چار برس بعد کی نوراں تو پورا چاند ہے۔ گول گول۔ بھرا بھرا۔ جس کی نوکیں کرچکی ہیں اور جو اپنا طباق سا روشن چہرہ لئے ہوئے ساری رات بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی سے سوتے جاگتے انسانوں کی حرکتیں اور "خفیف الحرکتیاں" دیکھتا رہتا ہے۔

اچھا تو یہ وہی نُوراں ہے !

کتنی بدل گئی تھی نوراں۔ بالکل بکائن کے اس پیڑ کی طرح جسے آج سے چھ برس پہلے میں نے اپنے آنگن میں لگایا تھا تو ہُوا کے معمولی سے معمولی جھونکے سے بھی محفوظ رکھنے کے لئے میں نے اس کے اردگرد اس کے قد سے کئی گنا اُونچی باڑ سی کھڑی کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہ لچک لچک جاتا تھا۔ روٹھ روٹھ جاتا تھا۔ ایک دن زور کی بارش ہوئی تو مچل کر لیٹ گیا تھا اور دھوپ نے آکر اسے منایا تھا۔ یہی بکائن کا پیڑ اب ایک گھنا سایہ دار درخت تھا۔ اور اس کی شاخوں کے ساتھ اودے رنگ کے پھولوں کے جھُمکے سے آویزاں تھے اور ان میں سے ایسی خوشبو امڈی پڑ رہی تھی کہ میں نے اس بکائن کا نام دن کی رانی رکھ دیا تھا۔ شادابی اور طراوت سے لدے ہوتے اس گاتے سرسراتے پیڑ نے امّی اور میری چھوٹی بہن سلیقہ کی کھاٹوں، پیڑھیوں، چرخوں اور پٹاریوں کو پناہ دے رکھی تھی اور اس کی پھننگوں پر چڑیاں چہک رہی تھیں اور ان کی بالشت بھر کی اڑانوں سے ننھے ننھے اودے اودے پھُول ذرا ذرا سے موتیوں کی طرح میری امّی اور سلیقہ کے قدموں پر بکھرے جا رہے تھے اور پڑوس کی ایک ننھی سی بچّی سوئی کی مدد سے انہیں ایک ڈوری میں پرو کر گڑیا کے لئے ہار بنا رہی تھی۔

جب میں بکائن کے اس چھوٹے سے پودے کو سعید کے ہاں سے جڑ سمیت اکھیڑ لایا تھا تو میرے گھر کے آنگن میں سلیقہ اور اس کی ہم جولیاں بھنڈار بیٹھی تھیں۔ آنگن دھوپ

سے چھلک رہا تھا اور فرش کی مٹی تپ اور چمک رہی تھیں۔ مگر دس دس بارہ بارہ برس کی یہ لڑکیاں ریاضت کی حد تک چرخے چلا رہی تھیں۔ کئی ہاتھ پونیاں تھامے ہوتے اوپر جا رہے تھے کئی ہاتھ اس تیزی سے پونی کو تکلے کی طرف لئے جا رہے تھے جیسے تار پونی کے بجاتے ان کی ہتھیلیوں سے نکل رہا ہے۔ چرخے بھری بھری گمبھیر آوازوں سے گھوں گھوں کر رہے تھے اور تکلے سے لے کر چرخے کے چکر تک تنی ہوئی مہلیں کوندے کی سی تیزی سے بھاگی پھرتی تھیں۔ اور ان لڑکیوں کی ناک پر، اور اوپر کے ہونٹ کے سنہرے رؤوں پر اور نچلے ہونٹ کی محراب میں چھپی ہوئی قوس پر پسینے کے ذرا ذرا سے قطرے سوئی کی نوکوں کی طرح چمک رہے تھے۔

اور سب لڑکیاں یوں گا رہی تھیں جیسے پوجا کر رہی ہیں:

توں میری پونی توں میرا دھاگا
توں میرا دین تے توں میرا مان
ہتھی نہ تیز چلا ویں اڑیا،
جھلیاں ڈوراں ٹٹ نہ جان،

میں آنگن میں چند قدم ہی چلا تھا کہ سلیقہ نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر چرخوں پر سے کودتی آئی اور میری ناک کے پاس تالی بجا کر بولی "اہاہا! اب مزا آئے گا بھنڈار بیٹھنے کا۔ بھیا بکائن لاتے ہیں۔"

"ابھی سے جھولا کیوں نہیں ڈال لیتیں" کوئی لڑکی چہکی اور سب لڑکیاں پونیوں کو تکلوں سے لٹکاتی یا پٹاریوں میں رکھتی بھاگی آئیں۔

امی بھی آگئیں۔ بولیں۔ "یہ لڑکیاں تو بالکل بکائنوں کی طرح بڑھتی ہیں، آج گڑیا سے کھیل رہی ہیں کل بچے کو کھلا رہی ہیں۔"

"اوئی ا" چند لڑکیاں چونکیں اور پھر ناکوں کو دوپٹوں میں چھپا کر گلگلنے لگیں۔

میں کھرپا لے کر آنگن کے وسط میں زمین کھودنے لگا۔ ایک بار کھرپا زور سے مارا تو بہت سی مٹی اڑ کر میری آنکھوں میں گھس گئی اور میرے سامنے بیٹھی ہوئی ایک لڑکی شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوتے اور گردن ہلاتے ہوتے گانے لگی ؎

ہتھی نہ تیز چلا ویں اڑیا
جھلیاں ڈوراں ٹٹ نہ جان

یہ نُوراں تھی !

اور جب میں نے آنکھیں مل کر اور منہ میں گھسی ہوئی مٹی تھوک کر اس کی طرف دیکھا تھا تو وہ یوں سمٹی تھی کہ بالکل ذرا سی بن گئی تھی اور پھر گیند کی طرح سلیقہ کی ٹانگوں میں سے لڑھک کر نکلتی، مارے ہنسی کے پھرکی کی طرح گھومتی چکراتی اپنے چرخے کے پاس جا کر گر پڑی تھی۔

اور اب یہی نوراں بکائن کی طرح پتوں اور پھولوں سے لدی پھندی میرے سامنے سے نکل گئی تھی اور میں اسے پہچان تک نہیں سکا تھا۔ میں اپنی بکائن کو بھی تو پہلی نظر میں نہیں پہچان پایا تھا۔ اور پھر اس کے سائے میں دیر تک پیڑھی پر بیکار بیٹھا رہا تھا اور صرف اس خیال سے خوش ہوتا رہا تھا کہ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا خوشبودار سایہ میری تخلیق ہے۔ اس کے تنے میں میری انگلیوں کا مَس نمی بن کر رچا ہوّا ہے۔ اور اس وقت اس کی شاخیں جو نرم نرم ہلکورے لے رہی ہیں اور دھیرے دھیرے گنگنا بھی رہی ہیں اور اس کے پھُول جو کبھی گچھوں میں اور کبھی اکیلے متواتر برس رہے ہیں تو یہ پیڑ اپنے خالق کی پُوجا کر رہا ہے، بکائن میری آرتی اتار رہی ہیں۔

غروب آفتاب سے پہلے میں سعید کے ہمراہ حسب معمول باہر کھیتوں میں گیا تو ننھی بدلیاں شفق کے چھینٹے بن کر آسمان پر بکھری ہوئی تھیں اور ساری دھرتی گلابی ہو رہی تھی۔ ہُوا ٹھنڈے پانی کے گھونٹ بن کر جسم میں اتری جا رہی تھی اور پرندے چپ چاپ ایک طرف اڑے جا رہے تھے۔ میں نے انگڑائی لینے کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور دیر تک اٹھائے رکھے تو سعید بولا "بڑی لمبی انگڑائی لے رہے ہو؟"

میں شاعری کرنے لگا "عام شامیں مجھے اداس کر دیتی ہیں مگر ایسی پیاری پیاری کبھی کبھی آنے والی شاموں میں مجھے کچھ عیب سا لگتا ہے، جیسے آنکھوں میں سے نظریں نہیں نکل رہیں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ جو ہر طرف لپک کر خوبصورتی کو جیسے چھونا اور ٹٹولنا چاہتے ہیں۔"

سعید بولا "آج تم نے نوراں کو دیکھا ہے نا۔"

مجھے جیسے بھولی ہوئی بات یاد آ گئی اور میں ذرا سا مُسکرا دیا۔

سعید اداسی سے بولا۔ "میں تو جس دن نوراں کو دیکھ لوں تو بڑا دُکھی ہو جاتا ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا

سعید بالکل رونی آواز میں بولا "یار یہ نوراں ہے نا۔ یہ بڑی بدمعاش ہو گئی ہے۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔

سعید بولتا چلا گیا۔ "اتنی بدنام ہے وہ کہ اگر تم کسی کو بتاؤ کہ نوراں بدمعاش ہے تو سب ہنس دیں گے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ پانی گیلا ہے۔" وہ ذرا سا رُک گیا۔ پھر بولا۔ "کوئی رات ایسی نہیں جاتی جب وہ کسی نہ کسی ——"

"شیطان سوار ہو گیا" میں نے بولنا ضروری سمجھا۔

"ہاں" سعید بولا "شیطان ہی سوار ہو گیا ورنہ جس عورت کا میاں ہر وقت اس کے پاس رہے، وہ اگر دوسروں سے منہ کالا کراتی پھرے تو ——" سعید فقروں کو نامکمل چھوڑنے لگا تھا۔

"بڑا بے غیرت نکلا رحیموں" میں نے کہا

"بے غیرت؟" سعید نے بڑے غصے سے کہا۔ "ایسا بدذات نکلا کہ کوئی موٹی سی گالی دینے کو جی چاہتا ہے۔ کبڈی کا اتنا اچھا کھلاڑی تھا۔ پھر پولیس میں سپاہی ہو گیا۔ سپاہی تھا جب بڑے دھوم دھڑکے سے شادی ہوئی۔ پھر ایک دن لمبی چھٹی پر گاؤں آ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ حضور کسی وجہ سے برخاست ہو چکے ہیں۔ چند روز طرہ باندھ کر گلیوں میں ٹہلا۔ کہیں سے قرضہ لے کر دُکان کھول لی، مگر سارا مال قرضے میں اُٹھ گیا تو ہاتھ جھاڑ کر گھر میں چھپ بیٹھا۔ فاقوں تک کو نوبت پہنچی۔ اب کبھی کبھی گلیوں کے موڑوں پر بیٹھا تنکے توڑتا نظر آ جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اور نوراں"

سعید نے کہا۔ "وہ اچھی بھلی تھی کہ اچانک ایک دن بدنام ہو گئی، چند روز دکھائی نہیں دی مگر اس کے بعد جو گلی میں آئی تو کلیجے دھک سے رہ گئے، حیا سے آنکھیں تک نہیں جھکی ہوئی تھیں۔ کبڈی کے کھلاڑیوں کی طرح گلیوں میں بیٹھے ہوئے مردوں کے درمیان سے تن کر نکلی اور جلتے ہوکیا کیا؟ مسجد کی محراب کو چوم کر واپس چلی گئی۔"

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر میں نے پوچھا" رحیموں نہیں ٹوکتا نوراں کو؟"

"اس حرامزادے کا نام نہ لو میرے سامنے" سعید پھر غصے میں آ گیا۔" نوراں کی بدمعاشی کا وقت آتا ہے تو چوپال پر آ جاتا ہے اور یہاں ایک کونے میں بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔"

ایک لمحہ سوچ کر میں نے کہا" آخر یہ نامرد کر کیا رہا ہے؟"

"قرضہ اتار رہا ہے" سعید نے تلخی سے جواب دیا

اندھیرا ہونے لگا تھا۔ اکا دکا ستاروں نے آسمان میں سے اپنی نوکیں نکال لی تھیں اور کھیتوں میں سینکڑوں جھینگر اکٹھے چیخنے لگے تھے مگر جھینگروں کا یہ شور بڑھتے ہوئے اندھیرے اور نرم نرم ہوا میں بہتی ہوئی خاموشی کی سرسراہٹ بن گیا تھا۔ اور کچھ ایسا لگتا تھا جیسے جھینگر خاموش ہو گئے تو شام کی خاموشی ختم ہو جائے گی۔ پھر ایک دم گاؤں کے سب کتے ایک ساتھ بھونکنے لگے اور دور ایک ڈھوک پر کوئی مرلیوں کی جوڑی بجانے لگا۔

"چلو چلیں" سعید نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے۔

میں چپ چاپ سعید کے ساتھ ہو لیا۔ گاؤں کی پہلی گلی تک ہم دونوں چپ چاپ چلے آئے، پھر وہاں سے ہم نے رات کو چوپال پر اکٹھے ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ میں اپنے گھر کے قریب پہنچ کر ذرا سا ٹھٹکا، مگر پھر آگے بڑھ گیا۔ پنجوں کے بل میں نوراں کے مکان کے قریب پہنچا تو مجھے دو آدمی دیوار سے لگے کھڑے نظر آئے۔ پھر ان میں سے ایک جیسے بھڑک کر دیوار سے ہٹا اور بھاگنے کی حد تک تیز تیز قدم اٹھاتا گلی کے اندھیرے میں اُتر گیا۔

"کون ہے؟" میں نے دوسرے آدمی کو ڈپٹ کر پوچھا۔

"تم ہو بیٹا؟" آواز آئی۔

یہ رحیموں کی ماں تھی۔

ایک دم جیسے میرے پیٹ میں سے غبار سا اُٹھا اور میرے گلے میں پھنس کر رہ گیا۔ پھر میں نے بڑی کوشش سے لرزتی ہوئی آواز کو رعب میں لپیٹتے ہوئے کہا" یہ کون تھا؟"

بڑھیا نے میرا ہاتھ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے سوکھے ہوئے ہاتھ میں لے لیا اور بولی" بُرا نہ

مانو بیٹا۔ اللہ میری نوُراں کو معاف کرے، اللہ ہم سب کو معاف کرے۔"

بے چاری نوراں، میں نے سوچا۔ کیا خُدا کو معافیاں دینے کے سوا اور کچھ کام ہی نہیں۔ بدذات، بے غیرت!

"بے غیرت" میں نے کہا اور اپنا ہاتھ جھٹک لیا۔

بڑھیا یوں خاموش ہو گئی جیسے اعتراف جُرم کر چکی ہے۔

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔

پھر میں بولا "بے شرمی کی بات ہے لیکن نوُراں رات میں کتنا کما لیتی ہے؟"

اندھیرے میں مجھے بڑھیا کے آنسو نظر نہ آئے مگر اس کی آواز میں سیلن تھی۔ بولی۔ "ہم کنجر تو نہیں ہیں بیٹا۔"

میں نے کہا "اسی لئے میں کہتا ہوں کمبختو کہ خُدا کے غضب سے ڈرو، بھرے گاؤں میں ایسا قہر نہ توڑتی پھرو، تم ہمارے پڑوسی ہو اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے یہ کہے کہ تمہارے پڑوس میں چکلا ہے۔"

اچانک اندر سے نوراں کی آواز آئی "میں تو گرمی سے مر گئی ماسی۔"

بڑھیا زار زار رونے لگی۔ مگر آواز کو بلند ہونے سے روکنے کے لئے منہ میں کپڑا ٹھونس لیا۔

میں نے کہا "خدا کے لئے یہ کمینگی چھوڑ دو، میں تمہیں ہر روز ایک روپیہ دے دیا کروں گا۔"

نوراں کی آواز اب کے جیسے صحن سے آئی "وہاں کھڑی کیوں سوکھ رہی ہو ماسی۔ ادھر آؤ میں تمہارے پاؤں داب دوں۔"

میں نے جلدی سے ایک روپیہ نکال کر بڑھیا کے آنسوؤں بھرے ہاتھوں میں ٹھونسا اور بھاگ آیا۔

اس رات مجھے کچھ ایسی نیند آئی جیسے ہلکا ہلکا میٹھا میٹھا بخار ہے۔ یا جیسے صبح منہ اندھیرے لاری پکڑنا ہو اور مارے فکر کے نیند میں جھٹکے سے لگ رہے ہوں۔

صبح کو اُٹھتے ہی چپلی گھسیٹتا نوراں کے گھر کی طرف لپکا چلا گیا مگر اس کے صحن کی طرف دیکھے بغیر ناک کی سیدھ میں آگے نکل گیا۔

میں گلی میں سے یوں گزرا جیسے میں کنکر ہوں اور مجھے کسی شریر بچے نے اپنے بازو کی قوت آزمانے کے لئے پھینکا ہے۔

دوسری گلی سے واپس آ کر میں اپنی ڈیوڑھی کے پاس آیا تو شریر بچے نے مجھے پھر سے اچھال دینا چاہا مگر میں نے جیسے اپنے آپ کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر جلدی سے اندر کمرے میں پلنگ پر لا ڈالا اور کتنی ہی دیر تک چھت کی کڑیوں پر نظریں جمائے آسمان کو دیکھتا رہا، عجیب سی بات ہے مگر مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اس روز میں سعید تک سے نہ ملا۔

شام کے بعد نُوراں کے گھر کی راہ لی۔ بڑھیا دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھا اور آگے نکل گیا۔ وہ بھی کچھ نہیں بولی۔ اور میں تو خیر کنکر تھا جسے کسی شریر بچّے نے اچھال دیا تھا۔

چند روز تک میرا یہی معمول رہا۔

پھر ایک دن میں نے سعید کو سارا قصّہ کہہ سنایا۔ وہ ہکا بکا کھڑا مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "نوراں سے ملے بغیر روپیہ دے ڈالتے ہو؟"

"ہاں!" میں نے کہا

"اچھا!" اس نے سَر کو ایک طرف جھکا کر تعجب سے کہا اور جانے کیا سوچتا ہوا چلا گیا۔

دوسرے روز چوپال پر جانا ہوا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں جب ایک کسان بولا "کیا بات ہے؟ رحیموں کیوں نہیں آتا چوپال پر؟"

دوسرا بولا "نوراں کو چکلے بٹھانے لے گیا ہوگا۔ وہ بھی تو دنوں سے نظر نہیں آئی۔ پہلے آ کر مسجد کی محراب کو چومتی تھی، اب جانے کسے چُوم رہی ہے؟"

سب ہنسے تو ایک کونے سے سعید بولا "ایسا نہ کہو دوستو۔ وہ تو اب گلی میں بھی

نہیں آتی۔"

"چلّہ کاٹ رہی ہو گی" کسی دل جلے نے کہا۔

ایک زور کا قہقہہ لگا۔

"نہیں نہیں دوستو" سعید جیسے منبر پر سے بولا "گنہگار توبہ کرلے تو اللہ بھی بخش دیتا ہے۔"

"اللہ تو بخش دیتا ہے" ایک بوڑھے نے کہا "پر آدمی بخش دینے والی اسامی نہیں۔"

ہفتہ بھر تک ایسی ہی باتیں چلیں اور پھر جیسے گاؤں بھر میں اعلان ہو گیا کہ نوراں کی بدمعاشی کا دورہ ختم ہو گیا۔ اور چونکہ وہ بدمعاش نہیں رہی تھی اس لئے اس کا ذکر بھی بہت کم ہوتا تھا۔

میں اب تک تیس روپے دے چکا تھا۔ میرے روپے دینے اور بڑھیا کے روپے لینے کا عمل بالکل آٹومیٹک مشین کا سا تھا۔ بس میں دیتے جا رہا تھا اور وہ لئے جا رہی تھی۔ چپ چاپ، ہموار انداز میں۔ جیسے سورج نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔

میں اس تکرار سے اُکتا گیا تھا اور اسی لئے ایک شام مجھ سے ناغہ بھی ہو گیا۔ دوسرے روز میں نے سعید کی منت کی کہ کبھی کبھی وہی جا کر بڑھیا کو روپے دے آیا کرے۔ "یکمشت ہی کیوں نہ دے ڈالیں؟" میں نے پوچھا۔

اور اس نے کہا "اس طرح وہ یکمشت اڑا دیں گے۔ یہ لوگ بڑے ندیدے ہوتے ہیں۔"

اس روز محض تجربۃً سعید بڑھیا کو روپیہ دینے گیا۔ میں ڈیوڑھی کی دہلیز پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ تیزی سے واپس آیا اور بولا "بڑے افسوس کی بات ہے مجھ سے مذاق کرتے ہو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی غیر عورت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور تم کہتے تھے ہر روز وہاں بڑھیا موجود ہوتی ہے! وہاں تو تمہاری وہ بکائن کھڑی ہے اور میں گیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ——————"

سعید نے روپیہ میرے ہاتھ میں دے دیا اور بولا "تمہی جاؤ اور مجھے بخشو میرے خاندان کی عزت اتنی سستی نہیں۔"

سعید چلا گیا اور میں وہاں دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ آج اگر سچ مچ بڑھیا کی جگہ نُوراں

ڈیوٹی پر کھڑی ہے تو میں اسے غیرت دلاؤں گا، میں اسے بلور کی گولیوں، چرخوں اور پڑیوں، گیتوں اور بکائنوں کا واسطہ دے کر کہوں گا کہ تم میری پڑوسن ہو، میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں، تم اس وقت کیسی صاف ستھری اور بے داغ تھیں اور ——

میں یہی سوچتا ہوا نوراں کے گھر کی طرف چلا۔ وہاں پہنچ کر اس کے صحن میں جھانک رہا تھا تو کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور روپیہ میری مٹھی میں سے نکل کر کنکروں پر بج اُٹھا۔ میں نے چاند کی نرم نرم چاندنی میں دیکھا کہ میرے پاس نوراں کھڑی مسکرا رہی ہے۔

میرے پیٹ میں سے غبار سا اٹھا اور میرے حلق میں ٹھنس کر رہ گیا۔

"مجھے تمہارا قرضہ دینا ہے۔" وہ بولی

"قرضہ؟" مجھے اپنے پنتالیس روپے یاد آ گئے۔ "قرضہ کیسا؟" میں نے بن کر کہا۔

"وہ جو میں نے تمہاری بلور گولیاں چرائی تھیں۔" اس نے بچّے کی طرح کہا۔ پھر یوں ہنسی جیسے بلور کی گولیاں بج اٹھی ہیں۔

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ بولی۔ "یہاں کوئی نہیں آتا۔ یہاں ویسے ہی کوئی نہیں آتا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے خاموشی کے اس ذرا سے وقفے میں محسوس کیا کہ وہ رو رہی ہے اور گلی میں بالکل میرے پہلو میں کھڑی رو رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنے ہی چاندوں کے عکس تھے اور اس کے چہرے پر کتنے ہی چاند بھاگے جا رہے تھے۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "رو کیوں رہی ہو نوراں؟"

وہ بڑی مدھم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تمہارے کپڑوں سے بکائن کے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔"

اور وہ بچّوں کی طرح اُونچے اُونچے پھوٹ پھوٹ کر روتی صحن میں بھاگ گئی اور میں وہاں حواس باختہ بچّے کی طرح کھڑا زمین کے اس ٹکڑے کو گھورتا رہ گیا جہاں وہ ایک لمحہ

پہلے کھڑی تھی۔ اندر سے اس کی سسکیوں کی آواز آتی رہی جب یہ آواز رُکی تو میں واپس جانے لگا، موڑ پر جا کر مَیں نے یونہی پلٹ کر دیکھا تو وہ کنکروں پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے ٹھٹکتے دیکھا تو جلدی سے بولی۔ "مل جاتے گا مل جائے گا۔ تم جاؤ ــــــــ بدنام ہو جاؤ گے۔"

میں نوراں کی طرف لپکا اور اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ یوں چُپ چاپ بے حس و حرکت کھڑی رہی جیسے ہتھیار ڈال چکی ہے۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا تو چاندنی میں مجھے اس کا چہرہ بہت خوفناک لگا وہ مجھے مسلسل کتنی دیر تک گھورتی رہی، پھر اچانک اس نے روپے کو زمین پر پٹخ دیا۔ دہاڑیں مار کر روتی کنکروں پر ڈھیر ہو گئی اور میں وہاں سے بھاگ آیا۔

میں گاؤں ہی سے بھاگ آیا۔

پھر میں کراچی کے ایک دفتر میں فائلوں کے ڈھیر تلے چھُپ بیٹھا۔ نوراں کے خیال کو ذہن کے کونے کھدروں سے یُوں چن چن کر نکالنا چاہا جیسے کاغذ میں لپٹے ہوتے قیمے کو رکابی میں ڈال کر کاغذ پر سے گوشت کے بچے کھچے مہین مہین ٹکڑے اتارے جاتے ہیں، مگر یہ ٹکڑے کاغذ سے اترتے ہیں تو انگلیوں سے چمٹ جاتے ہیں۔

تھوڑے ہی عرصے بعد میں نے شادی کا بہانہ کر کے چھٹی لی اور گاؤں کا رُخ کیا۔ لاری گاؤں کے رقبے میں داخل ہوئی تو میں نے کھیتوں کی مینڈوں، پگڈنڈیوں اور کھلیانوں کو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا جیسے کوڑے میں گری ہوئی سوئی ڈھونڈ رہا ہوں۔ پنہاریاں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بناتے نظاروں میں آ رہی تھیں۔ وہ لاری کی آواز سن کر بازو اٹھاتیں اور گھڑے تھام لیتیں اور کھیتوں کی باڑ سے یوں لگ کر کھڑی ہو جاتیں جیسے نمائش گاہ کی دیوار پر تصویریں آویزاں ہیں۔ اور میں نے ہر تصویر کو گھور گھور کر دیکھا۔

لاری اڈے پر رُکی۔ میں تیزی سے گھر کی طرف چلا۔ کتنے ہی لوگ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے مگر میں اُن سے کچھ یُوں مصافحہ کر رہا تھا جیسے عید کی نماز پڑھنے کے بعد بھکاریوں میں پیسے تقسیم کر رہا ہوں۔

ایک مُدت کے بعد سورج غروب ہوا۔ مگر جب اندھیرا بڑھنے لگا تو دماغ میں پٹاخے سے چھوٹنے لگے، میں نوراں کے ہاں جانے کے بجائے سعید کے گھر جا نکلا۔ میں نے اس کی

منتیں کیں۔ میں اس کے سامنے رو تک دیا۔ اور اسے دس روپے کا ایک نوٹ دے کر اسے نوراں کے ہاں جانے کے لئے تیار کر لیا۔

سعید نوراں کے گھر کی طرف چلا گیا اور میں اپنی بیٹھک کی کھڑکی کے ساتھ یوں لگ کر بیٹھ گیا جیسے اب تک لاری پر سوار ہوں اور سفر کر رہا ہوں۔

ذرا سی دیر کے بعد سعید میرے پاس آیا۔ اور دس روپے کا نوٹ میرے سامنے رکھ کر بولا "نوراں کہتی ہے یہ اسے واپس دے دو، اور کہو اب اس کی ضرورت نہیں۔ اب میرا گھر والا نوکر ہو گیا ہے۔ اور مجھے تمہارا قرضہ نہیں بھولا۔"

ست بھرائی

جب وُہ پیدا ہوئی اور میراثن نے باہر جاکر عبداللہ کو بتایا کہ بیٹی ہوئی ہے تو عبداللہ نے چونک کر کہا " ہیں ؟ بیٹی ؟" پھر وہ ذرا سا رُک کر بولا " بھئی حد ہے "

میراثن روتی صُورت بنائے کھڑی رہی جیسے عبداللہ کے گھر میں موت ہو گئی ہے۔ پھر جب اُس نے دیکھا کہ عبداللہ نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا ہے تو وہ چپ چاپ واپس چلی آئی مگر ابھی صحن کے وسط ہی میں پہنچی تھی کہ عبداللہ اس کے پاس سے بگولے کی طرح نکل گیا اور بند دروازے پر جاکر پکارا " بالی ۔ ذرا میری بات سُننا "

آہستہ سے کواڑ کی چول جیسے " ہائے " کہہ کر رہ گئی اور عبداللہ کی بہن نے ڈر کر کواڑ کو وہیں روک لیا ۔ جیسے وہ ذرا سا اور کھُلا تو بین کرنے لگے گا ۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک طرف سے ہو کر باہر آ گئی ۔ اس کی صُورت کچھ ایسی ہو رہی تھی جیسے اُس نے اپنی گردن پر میراثن کا سر رکھ لیا ہے ۔

عبداللہ نے بالی کا ہاتھ پکڑ لیا " کیوں ؟ منہ سے خیر نکالنا "

بالی کی آنکھوں میں سے بہت سے آنسو قطاروں میں گر پڑے ۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی " بیٹی ہے "

عبداللہ مسکرانے لگا " حد ہے بھئی ۔ سچ کہتا ہوں ۔ تم مجھ سے ایک سال بڑی نہ ہوتیں تو میں تمہارے منہ پر تھپڑ دے مارتا "

" کیوں رے دوڑھے ؟" بالی نے حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھا اس نے اپنے چھوٹے

بھائی کا نام بگاڑ رکھا تھا مگر کچھ یوں کہ اس بگاڑ میں بھی بناؤ کی شان تھی۔

"اس لئے" عبداللہ بولا "اس لئے کہ تم میرے باپ کی سب سے بڑی اولاد ہو اور تمہارے بعد میں آیا تھا" اس نے ایک مونچھ کو تاؤ دے کر مونچھوں کا توازن بگاڑ دیا۔

اور بالی نے ہنس کر اس کے منہ پر ہلکا سا چپت مار دیا "ہٹ مچھیل کہیں کا۔"

عبداللہ نے ہنس کر پیچھے دیکھا۔ اور پھر بولا "شرم کرو بالی۔ میراثن دیکھ رہی ہے۔"

"تم میرے دیر ہو" بالی ذرا بلند آواز سے بولی ——— "چاہے میں تمہاری مونچھ توڑ کر تمہارے ہاتھ میں دے دوں۔"

"سنو بالی" عبداللہ نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا "سنو۔ اس کا نام ست بھرائی کیسا رہے گا؟"

اور جیسے بالی پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مارے خوشی کے سُرخی اس کے کانوں تک دوڑ گئی اور وہ ادھ کھلے کواڑوں کی طرف لپکی۔

اور مسکراتا ہوا عبداللہ باہر جانے لگا۔

صحن کے ایک طرف کھڑی ہوئی میراثن کا چہرہ بالکل خالی ہو کر رہ گیا تھا اور وہ بالکل اُلّو لگ رہی تھی۔

صحن کی پرلی طرف جا کر عبداللہ رکا۔ پھر تیزی سے پلٹا اور بند دروازے کے پاس جا کر پکارا۔ "بالی ذرا میری بات سننا۔"

کواڑ کی چول جیسے "واہ" کہہ کر رہ گئی اور اب کے بالی کا صرف سر باہر نکلا۔ وہ ابھی تک مسکرا رہی تھی۔ "کیا ہے دولھے؟" اس نے سرگوشی میں کہا "بار بار کیوں بھاگے آتے ہو؟ لوگ کیا کہیں گے کہ ادھر اولاد ہوئی ادھر دوڑے آئے۔ شرم کرو۔"

عبداللہ بولا "حد کرتی ہو" پھر آہستہ سے کہا "میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ کیسی ہے بیٹیا؟"

"چاند کی ٹکڑی ہے" بالی کی آواز سرگوشی کی حدوں کو پھاند گئی "جہاں پڑی رو رہی ہے وہاں جیسے لالٹین پڑی جل رہی ہے۔ چپہ چپہ بھر تو پلکیں ہیں اور آنکھیں تو جیسے ہیر سیال سے مانگ لائی ہے۔ بس؟ اب جاؤ دفع ہو" اور اس نے کواڑ بند کر دیئے۔

اور اگرچہ ست بھرائی کے متوقع سات بھائی کبھی نہ آئے مگر عبداللہ اور اس کی بیوی نیکاں نے ست بھرائی کو وہ ساری محبت دے ڈالی جو بصورتِ دیگر سات بھائیوں میں بٹ جاتی۔
اس کی پھوپھی نے پہلے روز اس کی جو تصویر کھینچی تھی وہ دراصل ایک ہلکا سا خاکہ تھا کیونکہ جب اس کو احساس ہوا کہ دوپٹے کے بغیر ابا کے سامنے چلے جانا بے حیائی ہے تو اس خاکے میں خطوں اور خموں، قوسوں اور دائروں کی ایک دُنیا آباد ہو گئی۔ اور کچھ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ست بھرائی کی تخلیق کرتے ہوئے قدرت نے اپنی حسن کاری پر کوئی الزام نہیں لینا چاہا تھا۔
ایک بار وہ بیمار ہوئی تو بخار ہفتے سے بڑھ گیا اور عبداللہ پاگل ہوتے ہوتے بچا اور جب نیکاں اپنے شوہر کو اللہ پر توکل کرنے کا مشورہ دے چکی تو خود بھی پاگل ہوتے ہوتے بچی۔ دونوں نے ہاتھ باندھ کر حکیم جی سے کہا کہ اگر بھرائی اچھی ہو گئی تو وہ اپنی زمینیں اور اپنا مکان ان کے نام لکھ دیں گے "آپ کے نام سارے مال کی رجسٹری کرانے کے بعد ہی سوچوں گا کہ اب کہاں جاؤں۔"
"کہاں جاؤ گے؟" حکیم جی نے پوچھا۔ وہ مریضوں کو اچھے اچھے مشوروں کے علاوہ موٹی موٹی گالیاں دینے میں بہت مشہور تھے مگر آج ان کے لہجے میں نرمی تھی۔
اور عبداللہ نے نیکاں کی طرف یوں دیکھا کہ اگر حکیم جی کے اس سوال کا جواب وہی دے ڈالتی تو اس پر کتنا بڑا احسان کرتی۔
اچانک وہ بولا۔ "یہی ایک بیٹی ہماری ساری دُنیا ہے حکیم جی۔ یہ نہ رہی تو ——"
حکیم جی بولے "اچھے باپ اپنے سروں پر بیٹیوں کی چھتیں نہیں ڈال لیا کرتے۔ انہیں چلتا کرتے ہیں۔ شادی بھی تو ایک طرح سے بیٹی کی موت ہی ہوتی ہے نا؟"
عبداللہ اپنے پیار پر اس پتھراؤ سے بکھر گیا "ادھر بھرائی کی سانسیں اٹکی پڑی ہیں ادھر آپ کو رشتوں ناتوں کی سوجھ رہی ہے۔ آپ بھی تو حد کرتے ہیں حکیم جی۔ میں نے تو آپ کی منت کی تھی اور آپ منبر پر جا کھڑے ہوئے۔ حد ہے۔"
اور جب حکیم جی عبداللہ کے لہجے اور تیوروں سے چونکے تو انہوں نے دیکھا کہ نیکاں نے اپنے آنسوؤں سے ان کے جوتے بھگو ڈالے ہیں۔ وہ بدک کر الگ جا کھڑے ہوئے اور عیادت

کے لئے آئی ہوئی پڑوسنوں کی طرف ہاتھ اُٹھاکر جیسے فریاد کرنے لگے "بھئی ان دونوں بدذاتوں کو سنبھالو کوئی۔ ذراسا محرقہ ہے چھوکری کو۔ سات دن کے بعد نہیں اترا تو تیرہ دن کے بعد اُتر جائے گا۔ اکیس دن کے بعد اتر جائے گا۔ پر مجھے تو ان گدھوں کی فکر ہے کہ بیٹی کے اچھا ہونے سے پہلے انہی حرامزادوں کے جنازے نہ اُٹھ جائیں۔"

اور حکیم جی نے جو اتنی بڑی بات کہہ دی تھی تو انہوں نے غلط نہیں کہا تھا کیونکہ جب تیرھویں دن بھرائی کا بخار ٹوٹا تو وہ بولی "ہم تو گھی شکر کھائیں گے پراٹھے کے ساتھ۔"

نیکاں نے آن کی آن میں توے پر دھپ سے پراٹھا ڈالا اور عبداللہ شکر سے تنکے چننے کے بعد کٹوری میں چُلو بھر گھی گرم کرنے بیٹھ گیا۔ اِدھر سے حکیم جی آ گئے، انہیں یوں مشغول دیکھا تو بولے "کیا ہو رہا ہے؟"

عبداللہ بولا "یہی جی وہ ذرا سی طبیعت چاہی تھی اس کی ——— کیا نام ہے، بھرائی کی۔ پراٹھا کھانے کو ——— تو وہ ——— وہی پک رہا ہے۔"

"میں پراٹھے کو کتے کے آگے ڈال دوں گا" حکیم جی گرجے۔

"حد ہے" عبداللہ آنکھیں پھاڑ کر آہستہ سے بولا۔

"زہر خود کھلاتے ہیں مریضوں کو" حکیم جی بولتے چلے گئے "اور جب مریض مر جاتا ہے تو حکیم کو صلواتیں سناتے ہیں خنزیر کے بچے۔ مجھ سے علاج کرانا ہے تو میری بات ماننی ہوگی۔ نہیں کرانا تو پراٹھا کیا سنکھیا کھلا دو۔ ابے جاہلو یہ تو سوچو کہ محرقے کے مریض کو جب تک بخار رہتا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اصل علاج تو بخار ٹوٹنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔"

پھر وہ اندر گئے۔ بھرائی کی نبض دیکھی۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور چلے گئے۔

اور شام تک بھرائی کو وہ شدت کا بخار چڑھا کہ آنچ آنے لگی۔

"کیا ہوا؟" حکیم جی نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا کھایا تھا اس نے؟"

"پراٹھا" نیکاں کے ہونٹوں سے یہ لفظ اچانک یوں ٹپک پڑا جیسے بے خیالی میں ہاتھ سے چینی کی پیالی گر پڑی ہے۔

"ذرا سا حکیم جی۔ بالکل ذرا سا۔" عبداللہ نے جیسے قتل کے الزام سے بچنے کے لئے اپنی صفائی پیش کرنا شروع کی۔" بالکل یہ میری چھنگلیا جتنا ذرا سا بھورا حکیم جی۔"

"کیوں دیا؟" حکیم جی گرجے۔

"وہ مانگتی جو تھی حکیم جی۔" عبداللہ بچوں کی طرح بولا۔

حکیم صاحب نے اسی لہجے میں پوچھا۔" اور اگر یہ تم سے اپنی پسند کا خصم مانگنے لگے تو لا دو گے؟"

عبداللہ زبان سے کچھ نہ بولا۔ مگر گردن کو یوں ذرا سی جنبش دی جیسے کہہ رہا ہے۔ "بھئی حد ہے۔"

"لا دو گے حرامزادو؟" حکیم جی تو ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

اندر بھرائی بڑبڑانے لگی۔" پھر جب گل فام نے ہاتھ رکھ دیئے —— سبز پری کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے —— اپنے ہاتھ رکھ دیئے، تو وہ سبز پری تھی نا۔ تو اس کو نیند آرہی ہے۔ اے اماں۔ اس چکی کی گھمر گھمر نے تو میرے کان کھالئے۔ مجھے تو نیند آئی ہے۔ کل پیس لینا۔ آج کوئی برات آنا ہے کہ چکیاں چل رہی ہیں؟"

"چکیاں؟" نیکاں نے آنکھیں پھاڑ کر حکیم جی کی طرف دیکھا۔

"چکیاں چل رہی ہیں؟" عبداللہ نے بھی حکیم جی ہی سے پوچھا"کہاں چل رہی ہیں چکیاں؟"

"تمہارے نصیبوں میں چل رہی ہیں۔" حکیم جی نے کندھے کا نیلا رومال ہاتھ میں لے کر آنکھیں ناک اور داڑھی صاف کی۔" بھگتو حرامزادو۔ اپنا کیا کیسا ناچتا ہوا سامنے آیا ہے۔ بھگتو۔ اب اس کے جہیز میں سے کفن کے لئے کوئی کپڑا نکال رکھو۔"

"حکیم جی!" عبداللہ یوں چیخا جیسے اس کے حلق سے چھوٹی بڑی آوازوں کا ایک فوارہ ایک فرّاٹے سے ابل پڑا ہے۔" قسم ہے قرآن مجید کی۔ حکیم ہو گئے تو اپنے گھر میں ہو گئے۔ ایسی بات پھر منہ سے نکالی تو عرق نکال دوں گا۔ حد ہو گئی یارو۔" اور وہ تڑ سے گر کر بیہوش ہو گیا۔

اور نیکاں اس سے پہلے چپ چاپ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ان کی بے ہوشیوں، بڑبڑاہٹوں اور رت جگوں کا یہ سلسلہ ہفتے بھر تک جاری رہا۔ بالی نے یہ خبر سنی تو اپنے گاؤں سے بھاگی آئی، علاقے بھر میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ بخار بیٹی کے ہتوا ہے اور گرمی ماں باپ کے دماغوں میں چڑھ گئی ہے۔ بیٹیاں اپنے ماں باپ کی ذرا سی گھرکی سن کر فوراً کہنے لگیں "ایک وہ بھرائی ہے خوش نصیب، اور ایک ہم ہیں کم بختیں کہ کٹورے سے ذرا سی لسی چھلک گئی اور ماں باپ جان کو آ گئے۔" ہل چلاتے ہوئے کسانوں اور حقہ پیتے ہوئے چوپالیوں سے لے کر تھانے کے سپاہیوں اور تحصیل کے محرروں تک میں یہ بات یوں مشہور ہو گئی جیسے کہیں آٹھ ٹانگوں والا بچھڑا پیدا ہو گیا ہے۔

بخار ٹوٹنے کے بعد بھرائی اتنی تیزی سے تندرست ہونا شروع ہوئی کہ چند ہی دنوں میں جیسے مساموں میں سے خون پھوٹ نکلے گا۔ یوں بھری بھری اور چھلکتی چھلکتی سی کہ جو دیکھتا نظریں ٹوٹ کر رہ جاتیں۔ اب اس کے نتھنوں میں ذرا سا ابھار آ گیا تھا اور ہونٹوں میں کچھ ایسا بھرا بھراپن جیسے بال پنے اور جوانی کے درمیان یہی محرقے کی منزل طے کرنا باقی تھی۔ اسے گنگنانے کی بھی عادت ہو گئی تھی۔ جھاڑو دیتے ہوئے، چکی پیستے ہوتے، آٹا گوندھتے ہوئے وہ مسلسل گنگناتی رہتی اور جب عبداللہ اور اس کی بیوی نے دیکھا کہ یہ گنگناہٹ بلند ہوتی جا رہی ہے تو ایک دن عبداللہ نے کہا، "دیکھو بیٹی۔ یوں گایا نہ کرو۔"

"کیوں؟" بھرائی نے پوچھا۔

"اچھا نہیں ہوتا۔" عبداللہ نے ازلی و ابدی دلیل دی۔

"کیوں اچھا نہیں ہوتا؟" بھرائی نے اسی لہجے میں پوچھا۔

"بس نہیں اچھا ہوتا بیٹی۔" ماں نے فیصلہ سنایا۔

"کیوں؟" بھرائی بولی "ہم تو گائیں گے۔"

عبداللہ گردن کو "حد ہے" کی جنبش دے کر رہ گیا۔

اور نیکاں نے ہنس کر کہا "میری بیٹی کتنی پیاری لگتی ہے ضد کرتے ہوئے۔"

ضد کرتے ہوئے وہ سچ مچ بڑی پیاری لگتی تھی۔ چپ چاپ جھاڑو دے رہی ہوتی کہ ایک دم جھاڑو کو پٹخ دیتی اور کہتی "ہائے آگ لگے اس جھاڑو کو موئی ہتھیلی کاٹے لے

رہی ہے"۔۔۔۔۔۔ چکی پیستے پیستے جب بھی ذرا سی تھکی تو اسے تھکن کے ساتھ غصہ بھی آگیا۔ ہتھی کو جھٹکا دیا تو کبھی ہتھی ہاتھ میں چلی آرہی ہے اور کبھی چکی کا پاٹ کیل سے ہٹ کر جھرر سے پھسلتا آٹے میں ڈوب کر گنڈ توڑ گیا ہے۔ عبداللہ کے سر میں تیل ملتے ملتے اچانک ایک طرف ہٹ جاتی "تم خود تو بابا اپنی زبان سے کہتے ہی نہیں کہ بند کر دو" ہنڈیا تک کو کچرا چھوڑ کر پاؤں پھیلا لیتی "ہم سے یہ دھواں نہیں پھانکا جاتا۔ اُپلوں کا دھواں بھی کوئی دھوؤں میں دھواں ہے"، ایسے موقعوں پر اس کا رنگ گلابی ہو جاتا۔ پلکیں جھکتیں تو ٹھوڑی تک ان کے سائے دوڑ جاتے۔ کانوں کی شفاف لوؤں میں سونے کے ننھے ننھے "دُر" کپکپاتے اور پھر اگر اس وقت ماں نے ڈانٹا تو باپ نے ماں کو ڈانٹ دیا۔ اگر کبھی باپ نے گھُرکا تو ماں صدقے قربان ہو ہو گئی۔

مگر ایک روز جب ماں نے بھرائی کو ڈانٹا تو باپ بھی اس کی مدد کو نہ آیا۔ وہ صبح کھانا کھا کر پڑوس میں گئی اور دن ڈھلے تک واپس نہ آئی۔ پچھلے چند روز سے شہاب خاتون سے اس کی کچھ ایسی گاڑھی چھن رہی تھی کہ شام کے بعد بھی اس کے ہاں ایک بار ضرور ہو آتی تھی، مگر اس روز تو وہ گھنٹوں غائب رہی اور جب وہ دمکتا ہوا چہرہ اور چمکتی ہوئی آنکھیں لئے واپس آئی تو ماں نے اسے دہلیز پر ہی لیا۔

"یہ لچھن اچھے نہیں بیٹی کہ لالی آتے جاؤ اور لالی جاتے آؤ"۔ بھرائی کو ماں کی آواز ایسی خوفناک لگی جیسے وہ اس کے کانوں پر ہونٹ رکھ کر چیخ دی ہے۔

بھرائی دہل کر وہیں رُک گئی۔

عبداللہ بیٹھا چارپائی میں نئی ادوائن ڈال رہا تھا۔ بیکاں کے اس لہجے سے اس کا چونکنا فرض تھا لیکن وہ بھرائی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے بھرائی کو دراصل اسی نے جھڑکا ہے اور اب وہ اس جھڑکی کے ردِ عمل کا منتظر ہے۔

بھرائی نے باپ کی طرف یوں دیکھا جیسے دھوپ کی شدت میں مسافر گھنے درخت کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر جب اس نے باپ کے تیور دیکھے تو دہلیز ہی پر ڈھیر ہو کر یوں ٹوٹ کر روئی کہ اگر ماں باپ غصے میں نہ ہوتے تو مارے صدمے کے تیورا جاتے۔

آج بیٹی کو سینے سے لپٹا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا۔ ماں بولی "ایسی باتوں میں رونا دونا نہیں چلے گا۔ بیٹیوں کو لاڈ پیار دیا جاتا ہے عزت نہیں دے دی جاتی کہ جاؤ پڑوس میں جا کر گھنٹوں بیٹھی منہ پھاڑ پھاڑ کے ہنستی رہو، چاہے چادر سر سے اُتر جائے، چاہے تہ بند گھنٹوں تک اُٹھ آئے، اور تم وہاں بیٹھی قہقہے لگاتی رہو۔ میں نے چھت پر سے سب کچھ دیکھا ہے۔ آج دیکھا ہے، پھر کبھی نہ دیکھوں۔ پھر دیکھا تو رسیوں میں باندھ کے بٹھا دوں گی۔ جن ہاتھوں سے مکھن چٹایا ہے انہی ہاتھوں سے تمہارا اور اپنا گلہ بھی گھونٹ سکتی ہوں ــــــــ ہاں۔"

اب کے عبداللہ ہڑبڑا کر اٹھا تو اس کا گھٹنا چارپائی کی پائنتی سے ٹکرا کر تڑ سے بج اُٹھا۔ اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔ پھر گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا اور ذرا سا لنگڑاتا ہوا بیوی کے پاس آکر سختی سے بولا "بہت کہہ چکیں۔ سب کچھ ایک دم سے یوں نہیں کہہ ڈالتے کہ بات ختم ہو تو زبان لٹک پڑے۔ آج گئی تھی، پھر نہیں جائے گی۔ بس۔"

"میں تو جاؤں گی۔" بھرائی پہلی بار پوری قوت سے چیخی۔

عبداللہ کو پہلی بار محسوس ہوا کہ اس کی بیٹی بدصورت بھی ہو سکتی ہے۔

"نہیں جائے گی تو۔" اب کے عبداللہ نے اسے ڈانٹا۔

"کیوں؟" بھرائی نے روتے روتے یوں سر جھٹکا کہ اس کے سارے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے اور وہ بالوں کو ہٹائے بغیر گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی اور اس کے پہلو دھونکنیوں کی طرح اُٹھنے بیٹھنے لگے۔

"تو کیوں جاتی ہے وہاں؟" عبداللہ نے مردانہ جلد بازی اور اکھڑ پنے کا ثبوت دیا۔

"شانی میری سہیلی ہے۔" بھرائی کی بھرائی ہوئی آواز میں غصے کی رَو بدستور چل رہی تھی۔

اب کے نیکاں بولی "وہ تمہاری سہیلی ہے تو یہاں کیوں نہیں آ بیٹھتی تمہارے پاس؟ یہاں کوئی اسے نگلنے والا بیٹھا ہے جو ہمارے صحن میں آتے ہوئے اس کے پاؤں کی مہندی اترتی ہے! اور وہاں تو تھلوں کا رہنے والا اس کا وہ مشٹنڈا پھپھیر دن بھر پڑا اینڈتا ہے۔ جب سے اپنے ماموں کے گھر آیا ہے مونچھوں کو گھی سے چپڑنے کے سوا

اور کوئی کام کیا اس نے ؟ کہتے ہیں وہ چکوال سے بیلوں کی ایک جوڑی کا انتظار کر رہا ہے پر نہ بیل آ چکتے ہیں نہ ہمارا پڑوس ایک لفنگے سے خالی ہوتا ہے۔ اور تم دن بھر اس کے سامنے بیٹھی کیکر پر انگور چڑھاتی رہتی ہو؟"

نیکاں خاموش ہو گئی۔

عبداللہ بھی جیسے بیٹی کی جوابی دلیل کا انتظار کرنے لگا۔

بھرائی کا رونا بھی بند ہو گیا۔

اس نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔ بالوں کو جھٹک کر پیچھے پھینک دیا۔ آستینوں سے آنکھیں پونچھیں۔ گرا ہوا دوپٹہ سر پر رکھا اور وہاں سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی چھپر تلے جا بیٹھی۔

عبداللہ نے نہایت غصے میں نیکاں سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "یوں ایک دم سب کچھ بک دو تو اولاد بے شرم ہو جاتی ہے۔ ایک بار جھڑکا تھا تو پھر ذرا نرمی سے سمجھا دیتیں۔ اس کا دماغ چلا ہے کہ اپنی ضد پر اڑی رہے۔ اور پھر تم نے تو ایک آدمی کا بھی ذکر کر دیا۔ اس کے سامنے۔ حد ہے بھئی۔ یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہوتی۔"

نیکاں نے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ وہ رو رہی تھی۔

عبداللہ کو جیسے نیکاں کے آنسوؤں نے سند دے ڈالی۔ پلٹ کر چھپر تلے جا پہنچا۔ بھرائی اسی طرح گھٹنوں پر بازو پھیلائے اور سر رکھے بیٹھی تھی۔ عبداللہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی تک نہیں جیسے اسے پیار کے اس مس کا دیر سے انتظار تھا۔ ذرا سے وقفے کے بعد اس نے باپ کی طرف دیکھا اور سرخ آنکھوں میں ایک دم اتنے بہت سے آنسو امڈ آئے کہ پتلیاں تک ان میں پگھلتی معلوم ہوئیں اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو آنسو یوں ایک دم اس کی جھولی میں گرنے لگے جیسے کسی نے بھیگا دامن نچوڑ دیا ہے۔

پھر وہیں اس کی ماں بھی آ نکلی۔ اس سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ماتھا چومنے لگی۔ اس کی آنکھیں پونچھنے لگی اور پھر عبداللہ سے کہنے لگی "ذرا سی سوجی تو لے آتے۔ آج میٹھا کھانے

کو جی چاہ رہا ہے۔"

اس دِن سے بھرائی نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ دو روز کے بعد شابی اس کے ہاں آنکلی۔ چھپر تلے گلے شکوے ہوئے اور بھرائی نے اس سے کہا "تو میری سہیلی ہے تو یہاں کوئی تجھے تاکنے والا بیٹھا ہے جو ہمارے صحن میں آتے ہوئے تیرے پاؤں کی مہندی اُترتی ہے؟"

شابی سناٹے میں آگئی اور کچھ دیر تک بیٹھی اسے چپ چاپ گھورتی رہی۔

پھر بھرائی نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "زبان طوطا لے گیا کیا؟"

شابی مسکرا دی۔ صلح صفائی ہو گئی اور اس کے بعد روزانہ چھپر تلے دونوں کی بیٹھک لگنے لگی۔ شابی زور زور سے منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنستی۔ ہنسی کی ذرا سی بات پر بھرائی کے ایک دو دھموکے جڑ دیتی۔ دوپٹہ سر اور سینے سے گرتا تو گرا پڑا رہتا اور اسی حالت میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسا کر انہیں سر کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتی اور ہولے ہولے سروں میں کیکر پر انگور چڑھاتی رہتی۔

انہی دنوں گاؤں بھر کے اچھے اچھے گھروں سے بھرائی کے لئے پیغام آنے لگے تھے۔ اور دُور دُور کے دیہات کی نائنیں میراثنیں بھی کسی نہ کسی بہانے بھرائی کو دیکھنے آ رہی تھیں۔ اسی لئے جب ایک روز ابھی شابی نہیں آئی تھی تو بھرائی کو اس کی ماں ایک طرف لے گئی اور اسے بتایا کہ "یہ تمہاری شابی تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ لنگوٹ باندھ کر کبڈی کے میدان میں اترنے کی کسر باقی ہے ورنہ ویسے تو یہ تمہاری سہیلی سب گنوں میں پُوری ہے۔ آج کل ذرا لوگ بھی زیادہ آ جا رہے ہیں اس لئے احتیاط ضروری ہے۔ سمجھ گئیں نا؟"

"نہیں" بھرائی نے یہ لفظ یوں ادا کیا جیسے پرات میں کنکر گر پڑے۔

"وُہ نہ آیا کرے یہاں" نیکاں نے ڈانٹا۔

"تو میں وہاں چلی جایا کروں؟" بھرائی نے پوچھا

"نہیں" اب کے ماں نے پرات میں پتھر دے مارا۔

"کیوں؟" بھرائی بولی "نہ میں وہاں جاؤں نہ وُہ یہاں آئے تو پھر کیا یہاں بیٹھ کے مجھے چلّہ کاٹنا ہے۔"

"چلّے ہی کاٹنے پڑتے ہیں بیٹی رانی۔" عبداللہ دروازے میں سے بولا "خاندانوں کی عزتیں بیٹیوں کے چلّے کاٹنے ہی سے بڑھتی ہیں۔"

آج پھر دوطرفہ محاذ دیکھ کر بھراَئی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں سکیڑ لیں اور ان پر پلکوں کا سایہ کر کے جیسے کچھ دیر کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہی۔

عبداللہ دروازے پر ہی رُکا رہا۔

ماں گھٹنوں پر کہنیاں رکھے اسی طرح بیٹھی رہی۔

اور پھر بھراَئی اُٹھتے ہوئے بولی۔ "بہت اچھا۔ نہیں آئے گی۔"

"اور تم بھی نہیں جاؤ گی۔" ماں نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔ میں بھی نہیں جاؤں گی۔" بھراَئی بولی۔

پھر ایک ساتھ ماں باپ اس کی طرف جھپٹے اور اسے اُٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ ماں نے اسے اتنے پیار کر ڈالے جیسے اسے بھراَئی برسوں کے "وچھوڑے" کے بعد ملی ہے۔ باپ دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور پھر دکان سے سوجی لینے چلا گیا۔

اتنے میں شابی آنکلی ماں اُٹھ کر ایک طرف چلی گئی اور بھراَئی نے شابی سے ہولے ہولے کچھ ایسی باتیں کیں کہ اس کے چہرے پر باری باری ساتوں رنگ پھر گئے اور جب وُہ اُٹھی تو اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی "ہم تمہارے بغیر مرے تھوڑی جا رہے ہیں۔ ہاں۔"

عبداللہ سوجی لے کر آیا تو بیوی نے اسے بتایا کہ جب شابی واپس گئی ہے تو چہرہ مارے غصّے کے انگارہ ہو رہا تھا اور وہ بکے جا رہی تھی کہ ہم مر تھوڑی جائیں گے۔ "بڑا اچھا ہوا کہ بلا وقت پر ٹلی ورنہ شابی کے لچھنوں کی بات نکلتی تو بھراَئی پر آکر ٹھہرتی، بے چاری میری بھولی سی گڑیا بیٹی۔"

بیار کا ریلا آگیا تھا اس لئے عبداللہ بیٹی کی طرف بڑھا وہ پلنگ پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ عبداللہ نے جا کر سیدھا کیا تو اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ "ارے" عبداللہ بولا "حد ہے! یہ تو رو رہی ہے ساری سُنتی ہو نیک بخت! بھراَئی

نے رو رو کر آنکھیں سُجالی ہیں۔ حد ہے بھئی۔"

اور پھر وہیں سے نیکاں کو ڈانٹ پلانے لگا۔" آخر ایسا بھی کیا کہ آدمی بیٹی کے سرہانے لٹھ لے کر بیٹھ جائے کہ اٹھو گی تو کھوپڑی دو کر دی جائے گی تمہارے جیسی مائیں مل جائیں ساری دنیا کی بیٹیوں کو تو ڈولیوں کی جگہ جنازے نکل جائیں ان بے زبانوں کے۔"

ماں قریب آ گئی اور بولی۔" تم مردوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ آبرو مکڑی کا جالا ہے۔ آندھیاں بھی چلیں تو ایک تار تک نہ ٹوٹے۔ اور کوئی بچہ ہاتھ مارے تو انگلیوں میں لپٹا چلا آئے اور پھر تم اندھے تو ہو نہیں کہ گاؤں بھر کے بیٹوں کی ماؤں کو اپنے صحن میں اُمڈ کر آتا ہوا نہ دیکھ سکو۔"

پھر وہ ایک دم رُک گئی جیسے کفر بک گئی ہے۔ عبداللہ نے نہایت آہستہ سے کہا" ادھر تو آؤ۔"

عبداللہ نے بھرائی کے سر پر سے ہاتھ یوں اُٹھایا جیسے اسے گوند سے چپکا دیا گیا تھا۔

میاں بیوی "چولھانے" میں جا کر دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے اور جب وہاں سے ہٹے تو دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ عبداللہ نے بڑے پیار سے بھرائی کو چلم بھر لانے کے لئے کہا اور نیکاں چولھانے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے اچار کے میلے چیکٹ مٹکے کو زور زور سے ہلانے لگی کہ تیل اور مرچیں یک جان ہو جائیں۔

بھرائی نے گھر سے باہر کبھی قدم نہ رکھا اور نہ شابی اس کے گھر آئی۔ البتہ ایک روز شابی نے چھت پر سے بھرائی کی ماں کو ماسی کہہ کر پکارا۔ اس وقت بھرائی سالن کے لئے مسالے کو ذرا سا رگڑ کر دیوار سے لگی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ اس نے شابی کی آواز سنی تو چونک کر سب سے پہلے ماں کی طرف دیکھا اور ماں نے پلٹ کر کہا" کیا بات ہے شہاب خاتون؟"

بھرائی کا خیال تھا کہ ماں شابی پر برس پڑے گی مگر اس کے نرم لہجے کا سہارا لے کر وہ بھی اُٹھ بیٹھی۔

شابی نے کہا" آج ہماری ہنڈیا جل گئی ہے ماسی۔ ہم تو روکھا ہی کھا لیتے پر آج نظلوں سے وہ میرا پھیپھڑ بھر آ گیا ہے۔ ذرا سا اچار ہوگا؟"

"کیوں نہیں ہوگا؟" وہ مٹی کی بڑی سی رکابی اٹھا کر چولھانے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے میلے مٹکے کی طرف لپکی اور بولی" پر تو سیدھے راستے سے کیوں نہیں آ جاتی؟"

"وہ اپنی لاڈلی سے پوچھو" شابی نے کہا
اور بھرائی دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔
شابی کی بھی ہنسی چھوٹ گئی مگر اس نے منہ کو دوپٹے سے چھپانے کا تکلف نہ کیا۔
"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" نیکاں نے بیٹی سے پوچھا۔
اور بھرائی بولی۔" اپنی بھانجی سے پوچھیے۔"
پھر دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں اور ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔" کمبختنیں ہنستی بھی ہیں تو پہیلیاں بوجھواتی ہیں۔"
پنجوں کے بل کھڑے ہو کر نیکاں نے رکابی اُوپر بڑھائی۔ شابی منڈیر پر سے آدھی لٹک آئی اور ہاتھ بڑھایا مگر رکابی کو چھو بھی نہ سکی۔
بھرائی بولی۔" پیڑھی لے آؤں اماں؟"
"تو سیدھے راستے سے جا کر دے کیوں نہیں آتی؟" ماں نے رکابی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔
بھرائی نے کنکھیوں سے شابی کی طرف دیکھا اور دوپٹہ لہراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ دیر تک واپس نہ آئی۔ عبداللہ گھر آیا تو بولا۔" بھرائی نہ ہو تو سارا گھر کیسا اندھیرا اندھیرا سا لگتا ہے۔ کہاں گئی؟"
اور جب نیکاں نے اسے بتایا کہ بھرائی کو اس نے شابی کے ہاں اچار دینے بھیجا ہے تو عبداللہ بولا۔" چالیس سال کی عمر میں پہلی بار عقل کی کوئی بات کی ہے تم نے۔ آخر یہ بیٹیوں کو قید کر کے بٹھا دینا کہاں کی مامتا ہے؟ شابی کو بھی آنے دیا کرو۔ بات پکی ہو ہی چکی ہے۔ تاریخ پندھرویں مقرر ہوئی ہے۔ چاند گھڑی مار کر ابھرے گا تو برات چلے گی۔ میں نے بالی کے ہاں بھی نائی کو بھیج دیا ہے کہ گانے دھروانے آجائے۔"
"کس کی برات؟ کیسے گانے؟" بھرائی نے یوں پوچھا جیسے اسٹیج پر ایکٹنگ کر رہی ہے۔
عبداللہ بالکل بوکھلا گیا اور "ہوں، ہاں، یہ، وہ" کرتا رہ گیا۔ ماں نے بڑھ کر بھرائی کا ہاتھ تھاما۔ اسے کوٹھے میں لے گئی اور دیر تک باہر نہ نکلی اور جب نکلی تو ہنستی ہوئی۔" موتی یہ

شادیاں بھی عجیب جنجال ہیں۔ دیووں کے پاس قیدی پریوں کا سا حال ہوتا ہے کہ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ میں نے بھرائی کو بتایا ہے تو یوں تڑپ سے گری ہے جیسے اب جانے اٹھے گی بھی کہ نہیں۔ اور جو میں نے جھک کر دیکھا ہے تو رویا جا رہا ہے۔"

"رو رہی ہے؟" عبداللہ نے پوچھا

"ہاں!"

"پھر ہنسی بھی ہے؟"

"ابھی تو نہیں ہنسی" نیکاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پر ہنسے گی۔ ہنسنا تو پڑنا ہی ہے میں بھی جب آئی تھی تو روتی ہوئی آئی تھی نا۔ پھر ہنسنے بھی لگی۔"

"تم تو بن رہی تھیں۔" عبداللہ نے کہا۔

اور نیکاں نے اس کی پیٹھ پر چٹاخ سے ہاتھ مار دیا۔

اس روز سے بھرائی کی کچھ عجیب حالت ہو گئی۔ لوتھ کی لوتھ جہاں پڑی ہے بس پڑی ہے۔ گھر میں نائنوں میراثنوں کی آجاگی رہتی تھی۔ بکس کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ زیوروں کی پٹریاں اور گھنگھریاں بجتی تھیں۔ ریشم کے کپڑے سرسراتے تھے اور گڑ کی بوریوں اور گھی کے کنستروں نے کوٹھے کا ایک حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر بھرائی یونہی پڑی رہتی۔ کبھی کبھی شابی آنکلتی تو وہ پہلو بدلتی اور ذرا سا ہنس لیتی ورنہ چپ چاپ، آنکھوں میں دھول جھونکے بال اجاڑے میلے کپڑوں میں پڑی جھکتی رہتی۔

اور اس روز شام کو گھر میں گانے شروع ہونے والے تھے۔ جب عبداللہ اور نیکاں صبح کو اٹھے تو بھرائی کا بستر خالی پایا۔ کچھ دیر تک دونوں بیٹھے انتظار کرتے رہے، پھر نیکاں آنکھیں سکیڑے شابی کے ہاں گئی اور آنکھیں پھاڑے واپس آگئی۔ "وہاں تو نہیں۔"

"حد ہے" عبداللہ نے کہا

"آجائے گی۔" عبداللہ نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔

"آ تو جائے گی پر گئی کہاں؟" نیکاں نے پوچھا۔

"میں دیکھ آؤں؟ عبداللہ اٹھا۔

"کہاں جاؤ گے؟" نیکاں نے پوچھا
اور عبداللہ جہاں سے اُٹھا تھا وہیں بیٹھ گیا۔
کافی دیر تک دونوں خاموش رہے۔
پھر عبداللہ اُٹھا اور کوٹھے کے اندر جا کر پلنگوں کے نیچے جھانکنے لگا۔
"بیٹی ڈھونڈ رہے ہو کہ سوئی؟" نیکاں نے دروازے پر سے کہا اور اپنے ماتھے پر تڑاخ سے ایک ہاتھ مار کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئی اور بلبلا کر رونے لگی۔
"حد ہے،" عبداللہ بولا۔ "کیوں زمانے بھر میں ڈھنڈورا پیٹتی ہو پاگل کی بچی۔ آ جائے گی۔"
"پر گئی کہاں؟" وہ بچوں کی طرح مچل کر بولی۔
اور عبداللہ خاموش ہو گیا۔
ذرا سے وقفے کے بعد عبداللہ نے کوٹھے کے دروازے کا رُخ کیا اور کافی بلند آواز میں پکارا۔ "ست بھرائی۔"
اور ایک کوّے نے چولھانے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے مٹکے کا ڈھکنا نیچے گرا دیا۔
"تیر تیر تیر،" نیکاں کوّے کی طرف جھپٹی اور مٹکے کو اُٹھا کر اندر لے آئی پھر وہیں مٹکے کے پاس ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "جاؤ اسے لے آؤ کہیں سے۔"
"کہاں سے؟" عبداللہ نے پوچھا
اور نیکاں مرگی کے مریض کی طرح فرش پر لیٹ کر سر جھٹکنے اور پاؤں پٹخنے لگی۔
شام تک سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ بھرائی بھاگ گئی۔
شام تک گھبرا گھبرا کر پانی پیتے ہوئے میاں بیوی نڈھال ہو کر نیم بیہوش سے ہو گئے اور تھکی ماندی نو وارد بالی ان کے چہروں پر پانی چھڑکتے چھڑکتے بے حال ہو گئی۔ وہ گانے دھڑانے اور میراثنوں کے منہ میٹھے کرانے آئی تھی۔ مٹھائی کا دونا چولھانے کی سیڑھی پر رکھا تھا اور باہر گلی میں گاؤں کے نوجوان یوں بپھرے کھڑے تھے جیسے بھرائی کو بھگا لے جانے والا ان سب کو ننگا کر کے چلتا بنا ہے۔

دنوں تک کچھ پتہ نہ چلا کہ بھرائی کہاں گئی۔ دنوں تک لوگ گاؤں کے کنوؤں میں سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنتے رہے، اور دنوں تک حکیم جی یقین سے نہ کہہ سکے کہ عبداللہ اور نیکاں بچیں گے یا نہیں۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر یہ اچھے نہ ہوئے تو بالی کی بھی خیر نہیں کیونکہ دو نیم پاگل مریضوں کی تیمارداری کرنے اور ساتھ ساتھ روتے چلے جانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

پھر ایک دن عبداللہ کے نام ایک لفافہ آیا۔ جسے حکیم جی نے پڑھ کر سنایا۔ لکھا تھا:۔

جناب والد صاحب۔ قدمبوسی

آداب کے بعد عرض ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند تعالیٰ سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ میں اپنی مرضی سے شابی کے پھیپھر کے ساتھ یہاں تھلوں میں چلی آئی ہوں۔ میں نے شادی کر لی ہے۔ اور بڑے راضی خوشی ہیں۔ اُمید ہے آپ ناراض نہیں ہوں گے۔ اور مجھے معاف کر دیں گے۔ اولاد سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آپ نے اجازت دی تو آپ کے پاس جلدی آؤں گی۔ والدہ صاحبہ کو قدمبوسی اور مضمون واحد۔

آپ کی گنہگار بیٹی

ست بھرائی

"حد ہے" عبداللہ نے بستر پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"قطامہ، حرام زادی، کتیا" نیکاں نے کروٹ بدلتے ہوئے چنگھاڑ چنگھاڑ کر روتے ہوتے کہا۔

اس کے بعد اچانک وہ سنبھلنے لگے۔ اُٹھ بیٹھے، چلنے پھرنے لگے اور چند روز کے بعد انہوں نے بالی کو بہت سے کپڑے دے کر اسے اپنے گاؤں واپس بھیج دیا۔

راتوں کو وہ دونوں بھرائی کے جوتوں چولوں اور دوپٹوں کو سامنے رکھ کر روتے، اسے گالیاں دیتے۔ اس کے شوہر کی پشتیں نوم ڈالتے اور نیکاں کہتی "یہ سارا کیا دھرا اس کنجری کا ہے۔ یہ جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے اس کی سہیلی۔ میں نہیں کہتی تھی کہ منہ پھاڑ کر ہنسنے والے

کپڑے پھاڑ کر نکل جاتے ہیں۔"

"پر وُہ تو نہ نکلی۔"

"خود نہ نکلی پر نکلوایا تو ہے ـــــ تمہی نے ـــــ"

"میں نے؟" عبداللہ نے کہا "تمہی اس پر پہرہ دیتی رہیں۔ کھلا چھوڑ دیتیں تو آج ـــــ"

"بکواس مت کرو۔"

"خود کرتی ہو اور ـــــ"

"میں کہتی ہوں بکو مت۔"

"لو اور سنو ـــــ حد ہے۔"

مگر ایک روز ماں کے ذہن میں جانے کیا آئی کہ وہ آدھی رات کو بولی۔ "دُولھے۔ اے سنتے ہو؟"

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا

"سوئے نہیں؟"

"نہیں۔"

"سنو۔ یہ جو شابی کا پھیر تھا۔ تو یہ کچھ ایسا بُرا تو نہیں تھا۔"

عبداللہ خاموش رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بولا "ٹھیک کہتی ہو۔ بُرا تو نہیں تھا پر بُرا کر گیا۔"

"ہاں بُرا تو کیا اُس نے۔"

پھر دونوں سو گئے۔

"سنو" ایک رات عبداللہ نے بیوی کو پکارا۔

"کیا ہے؟" نیکاں نے پوچھا

"سوئی نہیں؟"

"نہیں۔"

"اس کے اب تک کتنے خط آچکے ہیں۔"

"چار۔"

"تو ہم بھی اسے ایک خط نہ لکھ ڈالیں؟"

"کیسا خط؟"

"کہ ہم نے تم کو بخشا۔"

"بیٹی کے ننگا ہو جانے کو بھی کوئی بخش سکتا ہے پگلے۔ہم بخشیں گے تو دُنیا تو نہیں بخشے گی نا۔"

"ہاں دُنیا تو نہیں بخشے گی۔"

"سو جاؤ۔"

پھر ایک روز انہیں ایک خط ملا۔

جناب والد صاحب۔ قدمبوسی

آداب کے بعد عرض ہے کہ آپ کو سُن کر خوشی ہو گی کہ آپ کو خُدا نے ایک نواسا دیا ہے۔ آپ کو مُبارک ہو۔ والدہ صاحبہ کو قدمبوسی اور مضمون واحد۔

آپ کی بیٹی

ست بھرائی

اس روز نیکاں دن بھر بیٹھی چکی پیستی رہی اور عبداللہ نے اتنی چلم پی کہ ہفتہ بھر کا تمباکو ایک دن میں پھونک ڈالا۔ شام کو وہ ذرا دیر کے لئے باہر گیا۔ اور جب آیا تو نیکاں نے پوچھا "یہ تمہاری بغل میں کیا ہے؟"

"تمباکو ہے۔" اس نے کہا۔ اور کوٹھے کے اندر چلا گیا۔

نیکاں اس کے پیچھے لپکی۔ عبداللہ پلنگ پر بیٹھ گیا مگر پھر اچانک اُٹھ کر بولا "کھیس کے نیچے کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے۔" اس نے کہا اور کھیس اُٹھا دیا۔

بیچ گلابی اور نیلے ریشم کے ٹکڑے ایک ننھی سی زریں ٹوپی اور دو ننھی ننھی سی طلائی جوتیاں رکھی تھیں۔

"میں نے کہا چلو ویسے ہی ۔۔۔۔" نیکاں ہکلانے لگی" دے نہیں سکتے پر بنا تو سکتے ہیں۔ بنا کے پھینک دیں گے پر بنائیں گے تو۔ آخر نواسہ ہے۔"

عبداللہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ بغل سے پوٹلی نکال کر پلنگ پر رکھی اور بولا" اسے کھولو تو۔"

اور جب نیکاں نے پوٹلی کھولی تو اس میں ریشمی کپڑے کے بہت سے ٹکڑوں کے علاوہ مخمل کی ننھی سی واسکٹ رکھی تھی۔

دونوں ایک ساتھ جیسے دھماکے کے ساتھ ہنسے پھر یونہی ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور پھر نیکاں نے بھرائی کے جہیز کے صندوق بھی پلنگ پہ کھول کر رکھ دیئے۔

اور کچھ دیر کے بعد گاؤں کے چوکیدار نے دیکھا کہ عبداللہ اور نیکاں سروں پر صندوق رکھے رات کے اندھیرے میں اس ڈھلوان شاہراہ سے اترے جا رہے ہیں جو سیدھی نخلوں کو جاتی ہے۔

موچی

چمڑے کے دو ٹکڑے مونج کی موٹی سی رسّی سے سلے ہوئے تھے۔ نادر نے مونج کی سیون کو بھگو کر چھرے سے کاٹتے ہوئے کہا "تم کہتے ہو یہ چمڑا کسی بڈھے بھینسے کا ہے اور پہلے ہی قدم پر باجرے کی روٹی کی طرح ادھ بیچ سے دو ہو جائے گا۔ پر پیارے۔ چمڑے کو ذرا سا بھیگ کر سوکھنے دو۔ پھر دیکھنا یہ کیسے تمہاری گھر والی کی طرح چیاں چیاں بولتا ہے۔"

پیارے نے ہنستے ہوئے ایک پرانا جوتا اٹھایا اور نادر کے پیٹ پر دے مارا "اُلّو کو ان دِنوں گھر والیوں کے سوا کوئی بات ہی نہیں سُوجھتی۔"

"شادی میں یہی کوئی دس دن باقی ہوں گے۔ کیوں نادرے؟" بابا اللہ بخش نے پوچھا۔

"دس دن چھوڑ دس گھڑیاں باقی ہوں۔" نادر بولا "پر بابا۔ تمہیں کیا۔ شادی تمہاری تو نہیں۔ میری ہے۔ تمہارے موچی کی۔"

"دہت تیری موچی کی۔" بابا اللہ بخش نے مصنوعی رعب میں تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر بے اختیار ہنسنے لگا۔

نادر نے پیارے کے پھینکے ہوئے جوتے کو اپنی گود سے ہٹایا تک نہیں۔ بولا "قصور کے جس سوداگر سے یہ چمڑا خریدا ہے وہ کہتا تھا کہ اس چمڑے کے تلے کا جوتا پہن کر گھر سے نکلو اور ولایت جا کر واپس گھر آجاؤ۔ تم گھس گھسا جاؤ تو ہمارا ذمہ نہیں پر یہ تلا نہیں گھسے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا۔" بابا اللہ بخش نے پیارے کو آنکھ مار کر کہا "کہ جس بھینسے کا یہ چمڑا ہے وہ فولاد کا کشتہ کھاتا تھا۔"

پیارا ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگا اور بابا اللہ بخش ذرا سا ہنس کر اور بہت سا کھانس کر اٹھا اور دروازے میں جا کر گلی میں تھوک دیا۔

نادر سکڑے ہوئے ہونٹوں میں پھوٹتی ہوئی مسکراہٹ سمیٹے مونج کی سیون کاٹتا رہا۔ ایک ٹکڑے کو الگ کر کے اسے سامنے کے صاف ستھرے چوکور پتھر پر اس زور سے بجایا کہ اللہ بخش "بہت تیری کی" کہہ کر رہ گیا اور باہر منڈیروں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں پر جیسے بندوق چل گئی۔ لمحہ بھر کے لئے کچھ ایسا سناٹا چھا گیا جیسے چمڑا نہیں بجا تھا، گولہ چھوٹا تھا۔

"بالکل گولا سا چھوٹا" بابا اللہ بخش نے ہتھیلیوں میں تمباکو ملتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی گولے بھی چھوٹیں گے؟" پیارے نے نادر سے پوچھا۔

اور نادر نے چمڑے کے ٹکڑے پر بھیگی دھجی پھیرتے ہوئے کہا "گولے نہیں چھوٹیں گے تو کیا بین ہوں گے! میری شادی ہو رہی ہے کوئی تمہارے باپ کا جنازہ تو نہیں اٹھ رہا۔"

پیارے نے دوسرا جوتا اٹھا کر نادر کے پیٹ پر دے مارا۔

بابا اللہ بخش اب کے سنجیدہ ہو گیا "جب سے آیا ہوں بکبکائے جا رہے ہیں جیسے جوانی سارے جگ میں بس انہی دو پر ٹوٹ پڑی ہے۔ ہنسی مذاق میں کسی کے مرنے کی بات نہیں کرتے۔ فرشتہ سن لیتا ہے۔"

"ہم دونوں یار ہیں بابا!" پیارا بولا "ہمارا مذاق چلتا ہے۔"

"ضرور چھوٹیں گے گولے" نادر جو زبان پر آئی ہوئی بات اب تک منہ میں سنبھالے بیٹھا تھا۔ بول اٹھا "جمعہ کہہ رہا تھا کہ اب کے لاہور سے بڑے بڑے نئے ڈیزائن کی آتشبازی سیکھ کر آیا ہے۔ کہتا ہے پہلے ایک چنگاری چمکتی ہے پھر ایک دم ایسا لگتا ہے جیسے آدھی رات کو سورج کودنے لگا۔ چنگاریوں کا چھاجوں مینہ برس پڑتا ہے۔ کہتا ہے آتشبازی بجھنے سے پہلے چنگاریاں آپس میں جڑ کر آگوں آگ پری بن جاتی ہیں اور جب یہ پری قہقہہ مار کر ہنستی ہے تو آتش بازی بجھ جاتی ہے۔"

"لاہور، لاہور ہی ہے۔" پیارے نے داد دی۔

اب تک کسی نے کونے میں دبکے ہوئے نور دادا کو نہیں دیکھا تھا۔ دراصل وہ ذرا سا

اُونگھ گیا تھا۔ نسوار کی ڈبیا میں سے تین انگلیوں کی چٹکی بھر کردہ نسوار کو پوپلے منہ کے دُور دراز کے کونوں کھدروں میں جھٹک آیا اور بولا "اے نادرے۔ چپلی کا دَدھر مرمت کر کے دینا ہے تو دے۔ جب سے آیا ہوں آتش بازیاں چھوڑ رہا ہے گدھا۔"

"دادا!" نادرے نے بڑی متانت سے پوچھا۔ "یہ بتا ایمان ایمان سے کہ جب تیری شادی ہوئی تھی تو کیا تو نے اپنا جنازہ پڑھا تھا؟"

"جنازہ پڑھوں تیری ماں کا!" نور دادا کڑکا۔ "ہم نے تو وہ لڈی ناچی تھی کہ ڈھولکیے نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور کہا تھا بس مالکو۔ مجھے بخش دو۔ تم تو نہیں تھکے پر میرا ڈھول بجنے کی جگہ چھینکنے لگا ہے۔"

"دادا" پیارے نے نتھنوں اور مونچھوں میں سے تمباکو کا گاڑھا دھوآں نکال کر چلم کو نادر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سُنا ہے تیرے سر پر جو سونے کا سہرا بندھا تھا مانگے کا۔ تو اس کی دو پتریاں توڑ کر تو نے ٹیبک میں اڑس لی تھیں۔"

نادر اور پیارا اندھا دھند ہنسنے لگے اور جب ہنس چکے تو نور دادا نے بڑی ہی متانت سے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا۔ "برخوردار و تم دونوں نادرے سے لے کر پیارے تک، ایک سے لے کر سو تک، بڑے ہی ولایتی قسم کے حرامزادے ہو۔"

ایک بار پھر گولہ چھوٹنے کے بعد کی سی خاموشی چھا گئی کیونکہ نادر تو خیر موچی ہونے کی وجہ سے گالی پی گیا مگر پیارا موچی نہ تھا۔ وہ نور دادا کی طرح گاؤں کے سب سے بڑے راجہ خاندان کا بھی فرد نہیں تھا۔ مگر وہ بابا اللہ بخش کی طرح کسان تھا اور وہ گالی مُفت میں نہیں کھا سکتا تھا۔ دے کر کھانے کی اور بات ہے۔

بابا اللہ بخش نے سہرے کی پتریوں کی چوری کے ذکر پر منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور صرف گنگنانے پر اکتفا کی تھی اس لئے نور دادا کے ہتّے سے بچ گیا تھا مگر پیارے کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر اپنی بزرگی کے مدِ نظر اس نے صورتِ حال کو سنبھالنا اپنا فرض سمجھا۔ بولا "دیکھ دادا۔ تو راجہ ہے تو اپنے گھر میں راجہ ہے۔ راجہ شیر خاں اگر تیرا کوئی دُور نزدیک کا بھانجا بھتیجا ہے تو ہوا کرے۔ پر اس موچی لڑکے سے سارے گاؤں کو بڑا پیار ہے۔ اور تیرا بھی تو پُرانا خدمت گار ہے۔"

آٹھ دس دن میں اس لڑکے کی شادی ہے۔ اس عُمر میں تو شادی کے خیال ہی سے ایسا ہو جاتا ہے جیسے کوئی گدگداتے جا رہا ہے۔ سو اگر لڑکے چہک رہے ہیں تو چہکنے دے۔ میں بھی تو تیری عُمر کے لگ بھگ کا ہُوں دادا۔ مجھ سے بھی تو یہ چہلیں کر رہے ہیں۔ یہ ان کا حق ہے۔ یہ ہمارے بچے ہیں اور نادر اموچی ہے تو کیا ہُوا؟ یہ بڑی چھوٹی بات ہے کہ جو تمہیں جوتا گانٹھ کر دے اس سے یہ بھی کہو کہ اب جوتا چاٹو بھی۔ زمانہ بڑا بدل گیا ہے دادا۔ بڑے بڑوں کی عزتیں ٹکے سیر بک رہی ہیں۔ گالی نہ دیا کر۔"

نور دادا نے نسوار بھرا لعاب یہاں سے وہاں تک تھوک کر کہا "میں موچی کی دکان پر آیا ہوں۔ مسجد میں نہیں آیا۔"

بابا اللہ بخش نے جیسے بالکل بے بس ہو کر کہا "یہ تم راجوں کے دماغ خُدا جانے ہمیشہ آسمان پر کیوں رہتے ہیں چاہے گھر میں پھوٹا کٹورا بھی نہ ہو۔"

نور دادا بولا "لڑائی کی بات کرنی ہے تو اپنے بیٹوں کو میرے بیٹوں کے پاس بھیج دے۔ دو دو ہاتھ ہو جائیں تو تیری بھی تسلّی ہو جائے گی۔"

بات بڑھ گئی تھی اس لئے سنجیدگی بھی بڑھ رہی تھی۔ نادر نے بجلی کی سی تیزی سے نور دادا کی چپلی اٹھائی اور آن کی آن میں ودّھر مرمّت کر دیا۔

اور جب نور دادا چلا گیا تو نادر بولا "میں تو سمجھا کہ اگر اب ودّھر نہیں گانٹھا تو نور دادا مار ڈالے گا۔ اور شادی سے پہلے بس منگنی کر کے مر جانا تو ایسا ہی ہے جیسے پیاسا شربت بھرے کٹورے کو باہر سے چاٹ کر چلتا بنے۔"

"اس کی بات چھوڑ" بابا اللہ بخش بولا "جب سے راجہ شیر خاں سے ڈپٹی کمشنر ملنے آیا ہے، سب راجوں کے دماغوں کو کچھ ہو گیا ہے۔ چاہے ہل چلاتے چلاتے ایڑیوں میں چپہ چپہ بھر دراڑیں پڑ گئی ہوں۔ یہ بتا۔ اب تک کچھ سامان بھی تیار کیا ہے کہ اپنے آپ کو ہی تیار کر رہا ہے؟"

بجھا ہُوا پیارا پھر سے چمک اُٹھا "بیوی سے اُدھار کر لے گا۔ کہہ دے گا پہلے شادی کر لے پھر زیوروں کا بھی دیکھ لیا جائے گا۔"

"زیور تو بنے رکھے ہیں" نادر بالکل بچہ سا نظر آنے لگا "اماں پر کیسے کیسے بُرے وقت

پڑے پر مجال ہے جو ایک چھلا بھی بیچا ہو۔ کہتی ہے شادی کے ایک سال بعد جو زیور اتارا ہے تو یہ کہہ کر اتارا ہے کہ اب بہو ہی پہنے گی۔ بیٹا برسوں بعد ملا پر بہو کا کنگن چوڑا پہلے سے تیار رکھا تھا۔ زیور ہے تو سب گلٹ کا۔ پر گلٹ بھی تو دھوپ میں چمک ہی جاتا ہے اور کنگن تو چاندی کے ہیں۔ میں نے ایک دن پہنے تھے۔ میرے پہنچوں پر بھی کھلے تھے۔ اماں کہتی ہے تیری منگیتر بڑے ہڈ کاٹھ والی ہے۔ اسے پورے آجائیں گے۔ پر پیارے۔ سوچتا ہوں اگر اس کے پہنچے ہی یہ ہوئے تو بازو کتنے ہوں گے! وہ تو مجھے مارے گی۔"

پیارا ہنسنے لگا۔

"بیوی بے چاری کیا مارے گی۔" بابا اللہ بخش بولا۔" ویسے نادرے۔ زیور تو ہو گیا پر کپڑے کا کیا کیا؟ اِن دنوں کپڑا تو کنجوس کا پیسہ ہو رہا ہے کہ ہلا ہلا، نہ ہلا نہ ملا۔"

نادر کے چہرے پر بہت سی اکٹھی رونق آگئی۔" وہ تو بابا چھ سات سال جو آپ مالکوں کی خدمت کر رہا ہوں تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہواتا ہی رہا۔ ایسے ایسے رنگ رنگیلے کپڑے رکھے ہیں کہ جی چاہتا ہے، سب گھنگھریاں لگی لنگوٹیں بنا ڈالوں اور ساری دُنیا سے کبڈی کھیلتا پھروں۔ عام کپڑا چھونے سے میلا ہوتا ہے وہ دیکھے سے میلے ہوئے جا رہے ہیں۔"

نادر ذرا سا رُک گیا۔ پھر کچھ اداس سا ہو کر بولا۔" ایک مصیبت مارے ڈال رہی ہے۔ اب جب ہم نے کوڑی کوڑی لگا دی ہے اور ادھر پیارے کے باپ سے سو روپیہ قرض بھی لے چکے ہیں تو لڑکی والوں نے کہلا بھیجا ہے کہ دُولھا کے کپڑے بھی تمہی بنوا کے لاؤ۔ پر کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے کہ تم لاتے ہو۔ لاؤ، اور ہمیں دے دو۔ ہم نکاح کے بعد ان کپڑوں کو اپنا کہہ کر دولھا کو پہنائیں گے۔"

"انکار کر دو۔" پیارے نے مشورہ دیا۔

"انکار تو کریں یار پر وہ کہتے ہیں کہ انکار کرنا ہے تو وہیں گھر میں بیٹھے رہو، برات نہ لانا۔ برات لاؤ گے تو گاؤں بھر کے کتے چھوڑ دیں گے۔"

"پھر؟" بابا اللہ بخش نے پوچھا۔

"پھر کیا بابا؟" نادر نے بھیگی ہوئی دھجی کو مٹھی میں مسلتے ہوئے کہا۔" پیسہ پیسہ جمع کیا تھا کہ

ذرا گولے دوسے چلائیں ولائیں گے۔ پر ان سے ایک ریشمی لنگی ـــــــــ"

"ریشمی لنگی؟" بابا اللہ بخش نے ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

"نواب نادر علی کی شادی ہے نا بابا" پیارے نے طنز کیا۔

"نہیں یار" نادر بولا" یہ بات نہیں۔ لڑکی والے کہتے ہیں کہ کپڑے بڑھیا ہونے چاہئیں۔ کہتے ہیں کپڑوں کے ساتھ جوتا بھی ہو۔ اور جوتا زری کا ہو۔ نوک سے ایڑی تک زری سے لپا تھپا ہوا ہو۔ اندر تلے پر بھی زری کی بیلیں ہوں۔ اور آج کل تم جانتے ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ زری زمین پر نہیں بنتی۔ سورج سے لانی پڑتی ہے قسم خدا کی۔ یہ جو چمڑہ کاٹا ہے تو زری لپا جوتا ہی تو بنانے چلا ہوں۔ انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ کپڑے جوتے ایسے ویسے ہوتے تو برات کو خالی ڈولی چلتا کر دیں گے۔"

"بڑے بدذات ہیں" بابا اللہ بخش بولا۔

"آخر کمینے ہیں" پیارے نے فقرہ کسا۔

اور نادر بالکل مرجھا سا گیا" ایسا نہ کہو پیارے۔ کمین تو میں بھی ہوں پر قسم خدا کی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کمینہ نہیں ہوں۔ سب کمین کمینے نہیں ہوتے پیارے۔ پھول گھورے پر بھی اُگ آتے ہیں۔"

پھر وہی گولہ چھوٹنے کے بعد کا سناٹا چھا گیا۔

نادر نچلے ہونٹ کے ایک گوشے کو اپنے دانتوں سے جیسے چبانے لگا بابا اللہ بخش اور پیارا زمین کو گھورنے لگے اور نادر نے سامنے رکھے ہوئے چمڑے کے بھیگے ہوئے ٹکڑے پر نظریں جما دیں۔ اس وقت تینوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ گلی میں سے ایک روتا ہوا بچہ ایک ہنستے ہوئے بچے کے پیچھے بھاگتا ہوا اور گالیاں دیتا ہوا گزر گیا۔ نادر کی بوڑھی ماں سر پر گھڑا رکھے دکان کے دروازے کے سامنے سے ہانپتی ہوئی گزری اور پھر ایک لمحے کو صحن کے دروازے میں سے دکھائی دی۔ چڑیوں کا غول ایک پل کے لئے منڈیروں پر اترا اور ذرا دیر کو دھاچوکڑی مچا کر کہیں غائب ہو گیا۔

نادر اس تکلیف دہ سناٹے کو توڑنے کے لئے مٹی کے ایک برتن کو کھسکا کر اس میں

سے تمباکو نکالنے لگا کہ اچانک پیارا بولا "نہیں یار تو رہنے دے میرے پاس بھی تمباکو ہے۔ تیرا تو آج کل ایک ایک پیسہ سو سو روپے کا ہے۔"

جلدی سے چلم کو تمباکو سے بھر کر پیارے نے ایک دو کش لگائے اور حقّہ بابا اللہ بخش کو تھما دیا۔ اس نے یوں پھیکا سا کش لگایا جیسے رسم ادا کر رہا ہے پھر دونوں اُٹھے اور "اچھا بھئی نادرے" کہہ کر کچھ اس تیزی سے باہر نکلے جیسے ذرا سا رُکے تو کوئی واردات ہو جائے گی۔

نادر ایک لمحے تک دروازے میں سے باہر گلی میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پانی میں انگلیوں کی پوریں ڈبوئیں اور ان کو جھٹک کر چمڑے کے ٹکڑے پر پھوار سی برسا دی۔ پھر اس پر دھجّی دوڑائی اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر تلے کی حد بندی کرنے لگا۔

"بسم اللہ کر دی؟" ماں نے صحن والے دروازے میں سے پوچھا۔

"کر دی اماں" وہ بڑے بے جان انداز میں بولا۔

ماں اس کے لہجے سے چونک کر اندر آ گئی اور دونوں ہاتھوں کو اس کے دونوں گالوں پر رکھ کر اس کے چہرے کو اُوپر اٹھایا۔ نادرے کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور وہ ضبط کرنے کی کوشش میں نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ چبائے جا رہا تھا۔

"تھپڑ مار دوں گی" ماں نے ایک ہاتھ تان کر کہا "اتنی گزر گئی۔ اب ذرا سی باقی ہے تو آنسو نکلے پڑ رہے ہیں۔ یہ جوتا جلدی سے تیار کر لو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ خُدا کی ذات بڑی بے پروا ہے بیٹے پر اتنی بے پروا بھی نہیں کہ اپنے موچی کی شادی عزت سے نہ ہونے دے۔ دیکھ لینا۔ رو‌ؤ مت بیٹے، آنسوؤں میں بینائی بہ جاتی ہے اور زری کے مہین تار کے کرتب دکھانے والوں کی بینائی نہ رہے تو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں اندھا نہیں ہے اندھا بنتا ہے۔ مفت کی ٹھونس ٹھونس کر اُپھر گیا ہے۔ سنا، رو‌ؤ مت۔"

اور جب نادر نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ آنسوؤں سے اپنی ساری جھُریاں چمکائے بیٹھی تھی۔ پھر وہ جیسے گھبرا کر اُٹھی اور صحن میں چلی گئی۔

زری کا یہ جوتا تیار کرنے میں نادر نے دن رات ایک کر دیئے۔ صبح سے لے کر شام تک "پٹا" لئے روشنی کا تعاقب کرتا رہتا اور جہاں بھی ذرا زیادہ چمک دکھائی دیتی بیٹھ جاتا اور رپتلے کاغذ

ایسے چمڑے پر زری چڑھانے میں یوں ڈوب سا جاتا۔ جیسے زمین سے سل کر رہ گیا ہے۔ سوئی کی سی باریک آر چر چر کرتی چمڑے میں گھستی۔ نیچے سے اس کا سرا اُدھر آتا۔ اور زری کے تار کو نیچے لے جاتا پھر آر اور دھاگے کی سوئی آپس میں الجھ کر ہٹ جاتیں اور یوں زری کے باریک بخیئے کی ایک منزل طے ہوتی۔

راتوں کو وہ کڑوے تیل کے چراغ کے پاس گھس کر بیٹھ جاتا اور جب آدھی رات کو کمہاروں کا گدھا پہلی بار رینکتا تو ماں منہ پر سے لحاف ہٹا کر کہتی "اب سو جاؤ بیٹے۔ آدھی رات گزر گئی۔ گدھا بولا ہے۔"

اور نادر ماں کو باتوں میں لگا لیتا۔ "اماں یہ گدھے ٹھیک آدھی ہی رات کو کیوں بولتے ہیں؟ ایسا لگتا ہے جیسے راجہ شیر خان کے بیٹے کی طرح ان کے پاس بھی گھڑیاں ہیں کہ وقت دیکھا اور رینکنے لگے۔"

"شریر کہیں کا۔" ماں کہتی وہ بہل جاتی یا اپنے آپ کو بہلا لیتی۔ بہر حال وہ کروٹ بدل لیتی لیکن نادر کو بار بار ٹوک کر اس بات کا ثبوت پیش کرتی رہتی کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

پھر جب پہلا مرغ بانگ دیتا تو وہ کہتی "بیٹے۔ آج کل رمضان شریف ہوتا تو اس وقت میں سحری کے لئے اٹھ بیٹھتی۔ اب سو جاؤ، اب نہیں سوؤ گے تو دن کو کون آ کر زری چڑھائے گا بھولے بادشاہ۔"

پھر وہ سو جاتا اور صبح ہوتے ہی پھر وہی چکر شروع ہو جاتا۔

اور جس روز جوتا مکمل ہو گیا اور نادر نے اس میں لکڑی کے کالبوت ٹھونس کر اسے دھوپ میں رکھا تو بڑھیا دیوار سے لگی بیٹھی چنگیر میں مہندی کی پتیاں ڈالے تنکے چن رہی تھی۔ جوتے کو دیکھا تو بلبلا اٹھی "انہیں میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا لو بیٹے۔" وہ چلائی۔

نادر لپک کر دروازے میں آ گیا۔ اور منہ پھاڑے دم بخود کھڑا ہو گیا۔

"ہٹا لو بیٹا۔" وہ بولتی گئی "نہیں ہٹاؤ گے تو میری پتلیاں تڑاخ سے ٹوٹ جائیں گی اتنی عمر ہو گئی خدا جھوٹ نہ بلوائے تو زری کے سو دو سو جوتے اپنے ہاتھوں سے گزار چکی ہوں پر قسم کھلوا لو جو ایسی چمک کسی دوسرے جوتے کی زری میں دیکھی ہو ایسا لگتا ہے

سورج دو ٹکڑوں میں بٹ کر کھڑکی میں اتر آیا ہے۔ زری چمکتی ہے۔ کرنیں نہیں چھوڑتی۔ پر یہ زری تو کرنیں چھوڑ رہی ہے۔ یہاں مجھ تک آ رہی ہیں کرنیں۔ یہ تو نے کیا کیا بیٹے، اتنی سی عمر میں ایسا ہنر تو بڑے سے بڑے موچی سے بھی تمہارے ہاتھ چُموالے۔" پھر وہ بھاگی بھاگی آئی۔ دونوں جوتے دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے اور انہیں ایک ایک بار چوم کر وہیں رکھ دیا۔ پھر اس نے نادر کے ہاتھ چوم لئے اور بولی "آخر میرے حلالی بیٹے ہونا۔"

"پر اماں" نادر بولا "اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"ہونا کیا ہے" بڑھیا یوں بولی جیسے بیٹے کا مذاق اڑا رہی ہے۔ "پرسوں برات کا تماشہ دیکھنے والوں کی نظریں بندھ کر رہ جائیں گی تمہارے پاؤں سے۔ چمڑا تو کہیں سے دکھائی نہیں دیتا۔ لگتا ہے جوتا خالص سونے کا ہے۔ موچی نے نہیں بنایا سُنار نے سانچے میں اتارا ہے۔ انصاف کی بات ہے۔"

"دُعا کرو اماں" نادر پھر اسی لہجے میں بولا۔

"پگلا" بڑھیا نے اس کا ہاتھ پیار سے جھٹک دیا۔ اور دیوار کے پاس جا کر مہندی کی پتیوں پر جُھک گئی۔

اس روز دن ڈھلے جب نادر نے جوتوں سے کالبوت نکالے تو بڑھیا بولی "اب ذرا سا پہن کے تو دکھاؤ۔"

جوتا پہننے سے پہلے نادر پر کچھ عجیب ڈراؤنی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر اس نے جوتا پہنا تو بڑھیا بولی "دشمن زیر، سجن ڈھیر۔ کاٹتا تو نہیں۔"

"نہیں"

"تو پھر ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک تو ہے پر ——"

اور پھر نادر چنگیر میں جوتا رکھے اور جوتے پر ریشمی رومال پھیلائے گھر سے نکلا تو بڑھیا نے دروازے پر سے کہا "فی امان اللہ"

نادر رُک گیا اور پلٹ کر بولا "اماں۔ اگر وہ نہ مانا۔ پھر؟"

"پھر کیا؟" بڑھیا بولی "تو کیا اب اللہ اپنے موچی کی شادی بھی نہیں ہونے دے گا؟ جا۔"

ایک گلی میں سے گزرا تو ادھر سے پیارا کندھے پر ہل رکھے، ایک نہایت منہ زور بیل کی رسّی پکڑے بیل کے پیچھے گھسٹتا ہوا اڑا آ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس سے تیزی سے گزرتے ہوئے بولا "مجھے پرسوں کی تاریخ یاد ہے نادرے۔ میں کل آؤں گا تمہارے پاس۔ کوئی کام وام ہو تو بتانا۔ اچھا۔"

"جیو پیارے۔" نادر بولا۔

"اور یہ کیا اٹھائے لئے جا رہے ہو؟" اس نے بہت آگے جا کر پوچھا اور پھر تیزی سے دوسری گلی میں مڑ گیا۔

اگلی گلی کے نکڑ پر بابا اللہ بخش ایک مجمع لگائے بیٹھا تھا۔ "یہ کیا اٹھائے لئے جا رہے ہو نادرے؟" اس نے نادر کے چپکے سے کھسک جانے کے ارادے پر خاک ڈال دی۔ "کہاں چلے؟"

"بس یہیں تک بابا۔" نادر نے گول مول جواب دے کر بات ٹالنی چاہی۔

"یہ کیا اٹھا رکھا ہے۔" بابا نے پوچھا۔

"جوتا۔" نادر سچ بول دیا۔ اور پھر گھبرا کر جانے لگا۔

"وہی جوتا؟" بابا اللہ بخش نے آواز دی۔

"ہاں بابا۔" نادر تیز تیز چلنے لگا جیسے بابا اللہ بخش اس سے جوتا چھیننے آ رہا ہے۔

"شادی والا؟" بابا کی آواز بلند ہو گئی۔

نادر دُور نکل آیا تھا اس لئے کچھ نہیں بولا۔

"ارے کوئی کام وام ہو تو بتانا۔" بابا پوری شدت سے پکارا۔

نادر چوپال کی طرف مڑ گیا۔

اور بابا اللہ بخش نے ایک موچی چھوکرے کے ہاتھوں بھرے مجمعے میں اپنی بھد ہوتے دیکھ کر ساری بات کو قہقہوں میں اڑانے کی ٹھانی وہ بولا "شادی سے کچھ دن

پہلے آدمی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ شادی کے وقت اصلی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور شادی کے بعد خود گھوڑا بن جاتا ہے۔" لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔

نادر جب چوپال پر پہنچا تو راجہ شیر خاں پلنگ پر کچھ یوں پھیل کر لیٹا ہوا تھا کہ اگر دوسرا پلنگ بھی ساتھ لگا دیا جاتا تو یہ پھیلاؤ اس کا بھی احاطہ کر لیتا۔ آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا اور بات نئے تھانیدار کی خطرناک دیانتداری کی ہو رہی تھی۔ نور دادا کہہ رہا تھا۔ "قتل کو بالکل ننگا کر کے رکھ دیتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ قتل بھی کوئی کھولنے کی چیز ہے۔ پھر یہ تھانیدار تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ قاتل کس خاندان سے ہے اور کہیں اس کی دس بیس مربع زمین تو نہیں۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ تھانے کا خدا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا۔" راجہ شیر خاں بولا۔ "کہ دشمن چاہے تمہارے سامنے ڈنڑ پیلتا پھرے۔ تم اسے ٹھکانے نہیں لگا سکتے۔ ٹھکانے لگاؤ گے تو خود ٹھکانے لگ جاؤ گے۔ چاہے تمہارے پاس سرکاری خدمات کی کتنی ہی سندیں کیوں نہ ہوں۔ اب کے بڑے کپتان کو آنے دو۔ میں اس کے کان میں یہ بات ڈال دوں گا کہ تھانے دار بے شک اپنا فرض بجالاتے پر یہ تو دیکھ لے کہ ملزم خاندانی آدمی ہے کہ کمین ہے۔"

اچانک راجہ شیر خاں کی نظریں نادر پر پڑیں لیکن وہ ڈھکی ہوئی چنگیر سے چونکا نہیں۔ راجہ شیر خاں کے ہاں نیا جوتا جب بھی سل کر آیا اسی ڈھب سے آیا۔

"لے آئے بھئی موچی۔" اس نے پوچھا

"جی" نادر بولا۔

"لا رکھ دے۔ پہنا۔" راجہ شیر خاں نے اپنے پھیلاؤ کو سمیٹا۔

"ایک عرض ہے۔" نادر نے ہولے سے کہا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"بول۔" راجہ بولا

"ادھر مالک ذرا ایک طرف بات کرنی ہے۔" نادر کے چہرے کی زردی میں نیلاہٹ نمودار ہونے لگی۔

"اچھا!" راجہ شیر خاں نرمی کے پرانے جوتے کی ایڑیوں کو اپنی ایڑیوں سے روند کر

انہیں سلیپر کی طرح گھسیٹتا ہوا چوپال کی کوٹھڑی کی طرف جانے لگا۔ "تم بھی پردے میں بات کرنے کی عمر کو آ پہنچے؟" اس نے نادر سے پوچھا اور پھر پلٹ کر داد طلب نگاہوں سے مجمعے پر نگاہ ڈالی۔ لوگ یہاں سے وہاں تک مسکرانے لگے۔

"اس کی شادی ہے نا کل پرسوں" نور دادا بولا۔ "اسی لئے نخرہ بڑھ گیا ہے۔"

نادر کے سر پر جیسے نور دادا نے پیچھے سے دھول جڑ دی اور دہلیز پر سے ٹھوکر کھا کر کوٹھڑی کے اندر لڑکھڑا کر جا پہنچا۔

اس نے چنگیر پر سے رومال ہٹایا اور جوتے کو یوں ہولے سے، دو انگلیوں کی پوروں میں اٹھا کر مونڈھے پر بیٹھے ہوئے راجہ شیر خاں کے سامنے لے گیا جیسے ذرا سا جھٹکا لگا تو جوتا کرچی کرچی ہو جائے گا۔

"واہ!" راجہ شیر خاں تڑپ اٹھا۔ "دیکھنے میں تو تحفہ ہے۔ بڑا باریک کام کیا ہے تو نے موچی۔ بالکل مشین کا کام لگتا ہے۔ جیسے سونے کی پتری ٹھپا لگا کر چڑھا دی ہے۔ واہ۔ اب پہنا بھی تو۔"

نادر نے راجہ کو جوتا پہنایا۔ راجہ اٹھ کر چند قدم اِدھر اُدھر چلا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ "اچھا ہے بھئی موچی۔ بہت اچھا ہے۔ بہت پسند آیا۔"

"راجہ جی۔" نادر نے سمٹ کر، بالکل ذرا سا ہو کر کہا۔

"کہو۔"

"پرسوں میری شادی ہے۔" وہ بولا۔

"وہ تو ابھی نور دادا نے جو بتایا ہے۔"

"میں نے راجہ جی آپ کی بڑی خدمت کی ہے۔" نادر جیسے حتی المقدور اپنے مقصد کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پھر؟"

"میرے باپ نے تو آپ کے اور بڑے راجہ جی کے قدموں میں عمر گزار دی" نادر نے کہا۔

"ہاں۔ اچھا مٹا ہوا کمین تھا" راجہ نے کہا۔

"بات یہ ہے جی" نادر نے رُک رُک کر بولنے لگا "میں نے زیور، کپڑا، سب کچھ تیار کر لیا۔ آج کتنے برسوں سے میں اور میری ماں محنت کر رہے ہیں۔ کوڑی کوڑی کر کے جو کچھ جمع کیا وُہ لگ گیا۔"

"لگ گیا ہوگا۔ پہلے روپیہ بچتا تھا۔ اب لگتا ہے۔" راجہ شیر خاں بولا۔

"اب جی" نادر کی آواز سرگوشی کی حد تک گر گئی "لڑکی والے کہتے ہیں کہ دُولھا کے کپڑے بھی ہمیں تیار کرائیں اور کسی کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہم نے تیار کرائے ہیں۔"

"کمین لوگ لڑکی دینے لگیں تو ایسی ہی کمینی باتیں کرتے ہیں۔" راجہ شیر خاں نے افلاطونیت چھانٹی۔

"وہ کہتے ہیں" نادر بولا "کپڑے ایسے ویسے بھی نہ ہوں۔ بہت اچھے ہوں۔ اور جوتا بھی ہو زری کا۔"

"زری کا جوتا؟" راجہ نے پوچھا۔

"جی۔"

"پھر؟"

"پھر جی" نادر نے راجہ شیر خاں کے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں اور اس کے نئے جوتے پر گاڑ دیں "پھر جی اگر آپ کا یہ جوتا ایک دن کے لئے مل جاتے تو ناک رہ جائے میرے گھر کی۔"

"وہ؟" راجہ شیر خاں نے پُرانے جُوتے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی یہ" نادر نے نئے جُوتے کی نوک چھُو لی۔

"یعنی تم میرا یہ نیا جُوتا پہنو گے؟" راجہ گرجتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر دروازے پر جا کر جیسے ہجوم کے سامنے تقریر کرنے لگا "یہ موچی چھوکرا میرا جُوتا اپنے پاؤں میں پہننا چاہتا ہے یارو۔ کہتا ہے میری شادی ہو رہی ہے ذرا سا پہن لینے دو کہ ٹھاٹھ رہ جائے۔ بدذات۔"

ہجوم پر گولہ چھُوٹنے کے بعد کا سا سنّاٹا چھا گیا۔

راجہ شیر خاں اپنے پلنگ کی طرف جانے لگا اور نادر کوٹھڑی کے دروازے میں سے

نکل کر دیوار کے ساتھ جیسے جم گیا۔

راجہ بولتا چلا گیا "میرا جوتا میرے پاؤں اور ان کمینوں کے سروں کے لئے ہوتا ہے۔"
وہ پلنگ پر جاکر پھیل گیا۔ "جی چاہتا ہے اسی جوتے سے چمڑی ادھیڑ ڈالوں اس کی۔ کتا۔ کمینہ۔"
پھر اس نے مڑ کر نادر کی طرف دیکھا اور کڑکا۔ "ادھر مر۔"

نادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلنگ کے پاس گیا۔

"پھر ایسا حوصلہ کیا تو چروا کے ڈال دوں گا۔" راجہ نے گھُرکا۔

ذرا سے وقفے کے بعد نادر بولا "قصور ہو گیا مالک۔"

"چل ہٹ یہاں سے۔" راجہ گرجا۔

نادر بولا۔ "اگر اس جوتے کے دام مِل جاتے راجہ جی تو میں جلدی جلدی سے اپنے جوتے کا کوئی انتظام ــــــــ"

"دام؟" راجہ شیر خاں کی آواز گونجنے لگی۔ "یعنی نقد دام مانگتا ہے؟ آج تک راجہ شیر خاں سے کسی نے نقد دام مانگے ہیں جو تو مانگنے چلا ہے۔ غضب خدا کا۔ دو پیسے کا جوتے گانٹھنے والا اور ساٹھ روپے کا جوتا پہنے بغیر ناک کٹی جا رہی ہے۔ چل دفع ہو یہاں سے۔ منشی جی۔ لکھ لو۔ اگلی فصل پر اس موچی کو پندرہ بیس روپے کی گندم تلوا دینا۔"

کفن دفن

برسوں سے میاں سیف الحق کا معمول تھا کہ "الصلوٰۃ خیرٌ من النّوم" کی آواز پہ جاگتے
اور نیلا رومال کندھے پر رکھ کر مسجد کی راہ لیتے۔ اور ابھی صبح کی کلی پوری طرح چٹک نہ پاتی کہ
صندل کی تسبیح پر استغفار کا ورد کرتے ہوئے گھر واپس آتے تازہ اخبار کی آمد تک قرآن شریف
کے چند رکوع، دعائے گنج العرش اور قصیدہ بردہ پڑھ لیتے۔ اخبار والا اخبار کو گول کر کے اُسے
کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے اندر پھینک دیتا اور کہتا "السّلام علیکم میاں جی"۔ سینے
پر چھو کر کے میاں سیف الحق "آ گئے میاں؟" پہلے کہتے اور "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" بعد میں۔
پھر وہ اخبار اُٹھا لیتے اور دن شروع ہو جاتا۔

میاں سیف الحق جب نوکری سے الگ ہوئے تھے تو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں
سپرنٹنڈنٹ تھے۔ تینوں بیٹے بڑے بڑے دفتروں میں بڑے بڑے کلرک تھے۔ چوتھا تار
کے محکمے میں کلرکی کا اُمیدوار تھا جب فسادات ہوئے تو وہ بازار میں سے گزرتے ہوئے
مار ڈالا گیا۔ تینوں بیٹیاں لاہور کے مختلف محلوں میں اپنے اپنے گھر اور گودیں آباد کئے بیٹھی
تھیں۔ میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار لک پھری چمکتی ہوئی سڑک تھی جو حدِ نظر تک
خطِ مستقیم میں جاتی تھی اور اس کے دونوں طرف قد آور درخت سایہ کئے کھڑے تھے۔ وہ
اس سڑک پر کچھ ایسی بے تکلفی اور روانی سے چل رہے تھے جیسے انسان کھانا کھاتے وقت چاہے
بات جیلیانوالہ باغ کی کر رہا ہو مگر نوالہ سیدھا منہ کو جائے۔ البتہ کبھی کبھی اس سڑک پر ایک فصیل
سی ابھر آتی اور وہ ٹھٹک کر خلا میں گھورتے رہ جاتے جہاں انہیں اپنے حامد کی کٹی پھٹی لاش

سڑک کے عین وسط میں پڑی ہوئی دکھائی دے جاتی اور وہ سوچتے۔ "تو کیا میرا بیٹا قیامت تک اسی طرح پڑا رہے گا؟" یہ خیال آتے ہی وہ "استغفر اللہ من کل ذنب" کا ورد کرنے لگتے۔ صندل کی تسبیح کے منکے ان کی پوروں سے رگڑ کر بھینی بھینی خوشبو چھوڑتے، پھسل گر جاتی اور میاں سیف الحق آگے بڑھ جاتے۔

آج بھی وہ صبح کی نماز کے بعد گھر واپس جا رہے تھے۔ وہ اپنی خوشبودار تسبیح پر استغفار پڑھ رہے تھے۔ صبح ابھی پوری طرح نہیں چمکی تھی۔ فضا نیلی ہو رہی تھی۔ اکا دکا پرندے یوں اڑے جا رہے تھے جیسے نیند سے بوجھل ہو رہے ہیں اور ابھی گر پڑیں گے۔ شریف چرسی کی سگرٹ پان کی دکان سے وہ ہمیشہ کترا کر نکلتے تھے۔ ایک بار صبح صبح (نور پیر کی گھڑیوں میں) چرس کے دھوئیں کے ایک بھبکے نے انہیں کچھ ایسا چکرا دیا تھا کہ دن بھر حلق تک جیسے چرس سے ٹھنسے پھرتے رہے۔ آج بھی وہ دکان سے بچ کر نکل گئے مگر چند قدم آگے جا کر رک گئے۔ پلٹ کر دیکھا اور سوچ کر جیب ٹٹولنے لگے۔

سڑک پر ایک شخص سر سے پیر تک ایک چادر اوڑھے سیدھا سیدھا لیٹا ہوا تھا اور دوسرا اس کے پاس بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ میاں سیف الحق کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ سورج ابھرنے سے پہلے ہی انہیں پٹڑی پر بھکاری بیٹھا نظر آیا ہو۔ وہ دن میں چند آنے کی خیرات ضرور تقسیم کرتے تھے لیکن ان کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ سورج نکلنے سے پہلے بھی انہیں کوئی بھکاری ملتا کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق یہی وہ وقت تھا جب خدا اور انسان کے درمیان فرشتوں کی فوجیں حائل نہیں ہوتی تھیں۔

انہوں نے جیب سے ایک چونی نکالی اور دور ہی سے بھکاری کی طرف پھینک دی۔ انہوں نے کتے کے سامنے ہڈی پھینکنے کے انداز میں خیرات آج تک نہیں دی تھی لیکن شریف چرسی کی دکان قریب تھی اور اگرچہ وہ بند تھی مگر میاں سیف الحق کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کواڑوں کی جھریوں میں سے چرس کا دھواں باہر امڈا پڑ رہا ہے۔

میاں سیف الحق کی چونی لیٹے ہوئے شخص کے پیٹ پر گری اور بیٹھا ہوا شخص کچھ یوں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے اب تک سو رہا تھا۔ میاں جی بھکاری کی اس بدحواسی کو

سولہ پیسوں کی خطیر رقم کے جلال و جبروت پر محمول کر کے خود آسودگی سے مسکرائے اور تسبیح کے منکے گراتے اور خوشبو اڑاتے ہوئے اپنی راہ جانے لگے۔

اچانک انہیں اپنے پیچھے تیز تیز قدموں کی آواز آئی انہوں نے مڑ کر دیکھا۔بھکاری ان کی طرف لپکا آرہا تھا مگر بار بار پلٹ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔پھر بھکاری ان کے بالکل پاس آ گیا اور پھر اس نے میاں سیف الحق کی چونی میاں سیف الحق کے تسبیح والے ہاتھ میں دے دی۔

میاں جی نے دیکھا کہ بھکاری کا چہرہ بالکل کیچڑ ہو رہا تھا۔مٹیالے رنگ پر پھیلے ہوئے آنسو کیچڑ ہی کی تو کیفیت پیدا کرتے ہیں۔وہ کچھ ایسا مسلا اور نچڑا ہوا لگ رہا تھا جیسے رس نکالنے والے شکنجے میں سے کچلا ہوا گنا لٹک رہا ہو۔میاں جی کو اس پر ترس آ گیا اور وہ اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے بولے "چونی کم تھی کیا؟"

بھکاری کی لپٹی اور بندھی ہوئی آواز میں کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے اس نے اپنے سر پر گرتی ہوئی چھت کو دونوں ہاتھوں سے بمشکل روک رکھا ہے۔وہ بولا "میں بھکاری تو نہیں ہوں جی۔ پر چونی بہت کم تھی۔مجھے تو پندرہ بیس روپے اور چند آدمی بھی چاہئیں۔"

میاں سیف الحق کا ہاتھ جیب سے نکل رہا تھا مگر اچانک یوں رک گیا جیسے سُن ہو کر رہ گیا ہے۔بھکاری نے بہت سی ہوا کو پانی کے ایک بڑے سے گھونٹ کی طرح نگل کر بولنے کی کوشش کی اور آنسو اس کے چہرے پر پھیلتے چلے گئے "اگر کفن ایک آنے میں مل جاتا تو میں آپ کو تین آنے واپس کر دیتا پر آج کل تو جی کپڑا بڑا مہنگا ہو رہا ہے۔میں ایک چونی لے کر کیا کروں گا؟"

میاں جی اسی طرح سن کھڑے رہے۔

"یہ میری بیوی کی میت ہے۔" وہ بولا "وہ مر گئی ہے۔"

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔" میاں سیف الحق نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں کس کر دبا لیا۔ان کے نتھنے زور زور سے پھڑکے اور آن کی آن میں ان کی ڈاڑھی کے بالوں نے ان کے بہت سے آنسو پرو لئے۔اور وہ کچھ یوں فق سے ہو گئے جیسے انہیں بھی رس نکالنے والے شکنجے میں سے گزرنا پڑا ہے۔

اخبار بیچنے والوں کا ایک انبوہ سڑک پر سے چیختا چلاتا ہوا گزر گیا۔ شریف چرسی کی دکان کے بند دروازے میں سے شریف کی بجتی ہوئی کھانسی کی آواز کے ساتھ چرس کی بُو سے لدا ہوا دھواں بھی آج سچ مچ باہر آنے لگا۔ بازاری کتوں کا ایک غول کدکڑے لگاتا ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گھس گیا۔ درختوں پر چڑیوں کے انبوہ اتر آئے اور صبح کی کلی کا سینہ چاک ہونے لگا۔

میاں سیف الحق لاش سے کچھ فاصلے پر جا کر رک گئے۔ ان کا نچلا ہونٹ اسی طرح دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر غیر قدرتی سی سُرخی آ گئی تھی اور ڈاڑھی کے بالوں میں اٹکے ہوتے آنسو نئے آنسوؤں کے لئے جگہ خالی کرتے ہوئے ان کے سینے پر ٹپک رہے تھے۔ "تو کیا اپنی بیوی کی لاش کو دفنانے کے لئے تمہارے پاس کفن بھی نہیں؟" وہ ایک عجیب اجنبی سی آواز میں بولے۔ "تو کیا میرے مولا کی دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے؟" ذرا سا رُک کر بے حد گھٹی اور پسی ہوئی آواز میں بولے۔ "تو کیا میرے حامد کی لاش بھی ————" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے اور انہیں یہ تک خیال نہ آیا کہ انہوں نے شریف چرسی کی دکان کے تختے کا سہارا لے لیا ہے اور ہوا میں چرس کی بو بس رہی ہے۔

اچانک انہوں نے کندھے پر سے رومال اُٹھا کر اپنے چہرے کو یوں ماتھے سے گردن تک پونچھ ڈالا جیسے وضو کر کے اُٹھے ہیں۔ پھر وہ لاش کے پاس آ گئے اور گلا صاف کر کے بولے "تمہارا یہاں کوئی بھی نہیں؟"

"جی نہیں" وہ بولا۔ وہ لاش کے پاس اسی طرح بیٹھ گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے یوں مسلسل آنسو گر رہے تھے جیسے آنسو رُک گئے تو وہ مر جائے گا۔

"تو پھر تم یہاں آئے کیوں؟" میاں جی نے پُوچھا۔

وہ کچھ یوں بولنے لگا جیسے سر پر سے ایک بہت بھاری گٹھڑی اتار رہا ہے اور جیسے میاں سیف الحق اس کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ "جب کلی کو تکلیف شروع ہوتی ہے ————" وہ رُک گیا۔ ایک لمحے کے بعد بولا۔ "میری بیوی کا نام کلی ہے۔" وہ پھر رُک گیا اور اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو اکٹھے بہہ گئے۔ "کلی تھا" اس نے اپنی تصحیح کی۔ "اس وقت اس نے کہا تھا۔

دیکھ غفورے۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ جو ترمرے سے ناچ رہے ہیں تو ماں کہتی تھی۔ یہ حضرت عزرائیل کے آنے کی نشانی ہے۔"

"پھر سُنیں گے" میاں سیف الحق ایک بار پھر رومال سے چہرہ پونچھتے ہوئے ایک بیل گاڑی کی طرف بڑھے۔ "اے ریڑھے والے بھائی" انھوں نے پکارا۔ "سنو تو۔ ذرا سا کام کر دو گے؟"

ریڑھے والے نے بیل روک لئے۔ میاں سیف الحق نے اسے بتایا کہ یہیں ایک فرلانگ کے فاصلے پر "ایک بی بی کی لاش لے جانی ہے۔"

ریڑھے والا جیسے حواس باختہ ہو کر ریڑھے سے کُود پڑا۔

"کیا لو گے؟" میاں سیف الحق نے پوچھا۔

ریڑھے والے نے حیرت اور ملامت کے ملے جُلے جذبات سے میاں سیف الحق کی طرف دیکھا۔ "جنازہ اُٹھانے کے بھی کسی نے کبھی دام لئے ہیں بھولے بادشاہ؟" وہ بولا۔ "پر بی بی سڑک پر کیسے مر گئی؟"

"میرے مولا کی دُنیا میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" میاں سیف الحق بولے "خدا تمہارا بھلا کرے۔ ریڑھا ادھر لے آؤ۔"

میاں سیف الحق واپس لاش کی طرف گئے تو غفورا حیرت اور ادب کے جذبات سے اُٹھ کھڑا ہوا اور میاں جی جیسے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے بولے "لاش میرے گھر جائے گی۔"

"آپ!" غفورا ہکّا کر رہ گیا۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" وہ بولے۔ "اس کا کفن دفن میرے ذمّے ہے۔ میرے حامد کے جنازے کو بھی تو کسی نے اپنے ذمّے لیا ہو گا۔"

"جی!" غفورا حیران رہ گیا۔

مگر جب تک ریڑھا آ گیا تھا۔ لاش کو اُٹھانے سے پہلے میاں سیف الحق نے غفورے سے پوچھا "اجازت ہے؟"

اور غفورا زور زور سے روتا ہوا میاں جی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ سڑک پر جاتے

ہوئے اِکّا دُکّا لوگ ٹھٹک گئے اور ان کی طرف آنے لگے۔ شریف چرسی کی دکان کا دروازہ چیختا چلّاتا ہوا کھلا اور وہ اندر سے بولا "کیا ہو گیا بھئی لوگو؟"

بلند آواز سے "اشہد ان لا الٰہ الاّ اللہ" پڑھتے ہوئے میاں سیف الحق اور غفورے نے لاش اٹھائی تو چوڑیاں بج اُٹھیں اور غفورا یوں ٹوٹ کر رو دیا کہ اگر میاں سیف الحق لاش کو سنبھال نہ لیتے تو وہ سڑک پر گر پڑتی۔ حواس باختہ لوگ مدد دینے کے لئے بڑھے مگر میاں جی نے سب کو روک دیا۔ "بی بی ہے" وہ بولے۔

"بی بی ہے!" کسی نے حیرت سے کہا "اور بی بی سڑک پر مر گئی!"

"پولیس کو بلانا چاہیئے" دوسرا بولا۔

"تم اس کے چچا لگتے ہو؟" پہلے نے پوچھا۔

اور پھر میاں سیف الحق کی آواز آئی "لے چل بھئی۔ سیدھا لے چل۔ کلمہ شہادت پڑھتا جا" اور وہ خود زور زور سے کلمۂ شہادت پڑھنے لگے۔

ریڑھے نے ذرا سی حرکت کی تو اچانک غفورے نے چیخ کر ریڑھے والے کو روکا۔ "روکنا بھائی۔ ٹھہرنا ذرا۔ کلی کا سَر ہل رہا ہے" میاں سیف الحق نے کندھے کا رومال کلی کے سَر کے ایک طرف رکھا۔ غفورے نے اپنی پگڑی دوسری طرف رکھ دی اور ریڑھا چلا۔ تینوں زیر لب کلمہ پڑھتے رہے اور ریڑھے کے پہیئے جیسے ہچکیاں لیتے اور روتے رہے اور جب ریڑھا میاں جی کے مکان کے سامنے رُکا تو ایک دم سارا محلّہ جمع ہو گیا۔ اور میاں سیف الحق کسی کو کچھ بتاتے بغیر اندر لپک گئے۔

ذرا سی دیر کے بعد میاں سیف الحق کے گھر میں کہرام سا مچ گیا اور آس پاس کے گھروں سے عورتیں کھڑکیوں سے آدھی آدھی لٹک کر میاں جی کے گھر کی طرف دیکھنے لگیں۔ میاں جی کی بیوی اور نوکرانی کے رونے کی آوازیں گلی میں کھڑے ہوئے لوگوں تک پہنچنے لگیں اور میاں جی اپنے بیٹوں کے ساتھ ایک پلنگ لے کر باہر آئے۔ انہوں نے محلّے کے ایک بزرگ کو الگ لے جا کر اسے ساری بات مختصر لفظوں میں سمجھائی اور پھر یہ بات سارے مجمعے میں نشر ہو گئی۔ سارے محلّے میں پھیل گئی۔ آس پاس کے محلّوں میں بھی اس کا

ذکر ہونے لگا اور لوگ میاں جی کی گلی میں جوق در جوق جمع ہونے لگے۔

غفورے اور میاں سیف الحق نے کلی کی لاش کو پلنگ پر رکھا مگر غفورے نے اب کے کلی کی چوڑیاں نہیں بجنے دیں۔ پہلے چوڑیاں بجی تھیں تو غفورے کو ایسا لگا تھا جیسے کلی کی لاش پر سے چادر اتر گئی ہے۔ میاں جی نے غفورے سے کہا "یہ میرے بیٹے ہیں انہیں مرحومہ بی بی کے بھائی سمجھ لو۔"

اس کا گلا بھر آیا تھا اس لئے صرف "جی" کہہ کر رہ گیا۔ اور ہجوم سے اپنے آنسو چھپانے کے لئے وہیں گلی میں بیٹھ کر سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اور لوگ اس کے ارد گرد یوں جمع ہو گئے جیسے انہیں کوئی عجوبہ ہاتھ آ گیا ہے۔

میاں سیف الحق اور ان کے بیٹے کلی کی لاش کو اندر لے گئے اور جب پلنگ کو صحن میں اتارا تو اس وقت پڑوس کے گھروں سے بہت سی عورتیں چھتیں پھاند کر میاں جی کے ہاں پہنچ چکی تھیں۔ رونے کا اتنا بڑا شور بلند ہوا کہ معلوم ہوتا تھا سارا لاہور ماتم کر رہا ہے۔

میاں جی کا ایک لڑکا قبرستان کی طرف چلا۔ دوسرا غسالن کو بلانے نکل گیا۔ تیسرے کو میاں سیف الحق نے عطر خس اور مشک کافور خریدنے کے سلسلے میں ہدایات دیں اور پھر کہا "کفن بہترین لٹھے کا ہو۔ مہنگا ہو تو ہوا کرے۔ یوں سمجھو کہ تم حامد کے لئے کفن لا رہے ہو۔"

پھر انہوں نے محلّے کے ہمدرد بزرگوں کو بیٹھک میں بٹھایا۔ نوجوان گلی میں ٹولیاں بنائے کھڑے رہے اور میاں جی غفورے کو ساتھ لے کر اس کمرے میں چلے گئے جہاں میز پر دھرے ہوئے رحل میں قرآن شریف، دُعائے گنج العرش اور قصیدہ بردہ رکھے تھے اور ٹوٹے ہوتے شیشے والی کھڑکی کے نیچے تازہ اخبار پڑا تھا۔

اور وہاں غفورے نے اپنے سر پر سے بھاری گٹھڑی اُتار دی اور اسے کھول کر اپنا ایک ایک دُکھ میاں سیف الحق کے سامنے رکھ دیا۔ "کلی اُمید سے تھی۔" اس نے بولنا شروع کیا۔ مگر گلا بھر آیا اور رُک گیا۔ پھر بولا "معاف کرنا میاں جی۔ رونا مردوں کا کام نہیں پر کلی تو میرا سارا غرور لے گئی۔"

میاں سیف الحق کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں جیسے غفورے کی تائید کر رہے ہوں۔

اب غفورے نے مسلسل بولنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز کبھی گھٹ جاتی۔ کبھی بھرا جاتی۔ کبھی آنسوؤں میں گھل کر بہ جاتی۔ مگر وہ بولتا چلا گیا۔ اور میاں سیف الحق بھیگی ہوئی آنکھوں سے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتے چلے گئے۔

"کلی اُمید سے تھی۔" اس نے کہا۔ "وہ کہتی تھی دیکھ غفورے۔ یہ جو میری آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچنے لگے ہیں تو یہ تو دوسری دُنیا کی نشانیاں ہیں۔ پچھلے دس دِن اسے اتنی تکلیف ہوئی کہ اگر اس کی عمر سولہ سترہ کی نہ ہوتی۔ میری طرح پینتیس چالیس کی ہوتی تو وہ اسی تکلیف میں مرگئی ہوتی۔ مَیں چونیاں میں ڈاک خانے کے ایک بابو کا نوکر ہوں۔ وہاں ایک سیانی سے بات کی۔ وہ بولی۔ کلی کا پیٹ کٹے گا۔ نہیں کٹے گا تو بچّہ مر جائے گا اور بچّہ پیٹ میں مر گیا تو یہ بھی مر جائے گی۔ کلی بولی۔ دیکھ غفورے۔ میرا پیٹ کٹوا دے۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ مَیں نے تو تم سے ابھی بہت تھوڑا سا پیار کیا ہے۔ ایسا کہا تھا اس نے۔ میں نے سیانی سے کہا۔ کاٹ دو۔ وہ بولی۔ لاہور لے جاؤ۔ پیٹ لاہور میں اچھا کٹے گا۔ مَیں اسے بچے کی طرح اُٹھا کر لاری میں بٹھا اور یہاں آگیا۔ یہاں مس نے کہا کہ کوئی پلنگ خالی نہیں ہے۔ میں نے کہا ہم پلنگوں والے نہیں۔ ہمیں تو کھٹولا بھی نہ مِلے تو زمین پر پڑ رہتے ہیں۔ اتنا بڑا ہسپتال ہے اسے کسی کونے کھدرے میں زمین پر ہی ڈال دو پر اس کا کچھ کرو۔ مس نے میری بات نہیں مانی۔ پھر کلی نے کہا ہم کسی درخت تلے پڑ رہتے ہیں۔ اس پر مس کو ترس آگیا اور اسے ایک پلنگ دے دیا اور مجھ سے کہا۔ جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کلی نے یہ سنا تو زور زور سے رونے لگی اور کہنے لگی۔ دیکھ غفورے۔ تو چلا گیا تو میں مر جاؤں گی۔ پر مس مجھے وہاں سے زبردستی باہر لے آئی اور مجھ سے میرا پتہ پوچھنے لگی۔ میں نے چونیاں کا پتہ لکھوایا تو بولی۔ یہاں کا پتہ بھی بتاؤ۔ میں نے کہا۔ میں تو ہر وقت ہسپتال کے دروازے پر مل جاؤں گا۔ میں تو یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں کہیں جا کر کیا کروں گا۔ پھر میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی اور کلی کہتی تھی۔ قرض کبھی نہ لینا ورنہ عمر بھر قرض ہی لیتے رہو گے۔ پرسوں شام کو میں ہسپتال میں گیا تو وہاں کوئی اور مس بیٹھی تھی۔ بولی۔ پیٹ کاٹنے سے پہلے ہی بچّہ ہو گیا ہے۔ پر تم کلی کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بے ہوش ہے۔ اس کا خُون نہیں رُکتا۔ پھر بولی۔ جاؤ۔ بچے کا نام سوچو۔ کل شام کو میں پھر اندر گیا۔ مس بولی۔ اب اس کی ناک سے بھی

خون بہنے لگا ہے۔ میں کلی کے پاس گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ میں نے کہا "کلی!" تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرانے لگی۔ خُدا کی قسم میاں جی وہ مسکراتی تھی۔ پھر وہ رُو دی اور بولی "دیکھ غفورے۔ تو نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ بچّہ ہوتا ہے تو ایسا بھی ہو جاتا ہے"۔ میں نے میاں جی اس وقت اس کے ماتھے میں موت کی لاٹ جلتی دیکھ لی تھی۔ پیلی تو وہ بہت ہو گئی تھی۔ پر یہ میلا رنگ پہلے اتنا چمکتا نہیں تھا۔ پرسوں رات چمک رہا تھا۔ میں نے کہا تو رو نہیں کلی۔ تو اب ٹھیک ہو جائے گی۔ بولی "دیکھ غفورے دوپہر کو جب میری ناک سے خون جاری ہو گیا تھا تو اس ساتھ والی نے مس کو بلا کر کہا تھا۔ دیکھو یہ لڑکی مر رہی ہے۔ تب سے میں بڑی ڈر گئی ہوں غفورے۔ ایک بار مس بچّے کو میرے پاس لائی ایسا لگا جیسے غفورا سمٹ کر ننھا سا ہو گیا ہے۔ وہ میرے پاس آیا پر مجھے تو دودھ پلانا ہی نہیں آتا میں نے کہا کیسے پلاؤں۔ تو یہ ادھر اُدھر والیاں ہنسنے لگیں۔ تب سے مجھے بڑا رونا آ رہا ہے۔ ان کو پتہ نہیں نا کہ یہ میرا پہلا بچّہ تھا اور میں بے چاری تو چونیاں کی رہنے والی ہوں"۔ میں جب ہسپتال سے آنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی "آج رات نہ جاؤ"۔ پھر جب میں نے کہا کہ سب ملاقاتی اُٹھے جا رہے ہیں اور وقت ہو گیا ہے تو وہ بولی "داتا گنج بخش لاہور میں ہے نا غفورے اس کے پاس جاؤ اور کہو۔ داتا۔ کلی مرے نہیں۔ کلی نے تیرے نام کی منّت مانی تھی تو غفورے کو پا لیا تھا اور کلی نے تو غفورے سے ابھی ذرا سا، چھنگلیا کے ناخن جتنا پیار کیا ہے" اس کا ہاتھ بڑا ہی ٹھنڈا تھا میاں جی۔ برف بھی ٹھنڈی ہوتی ہے پر وہ کچھ اور طرح ٹھنڈی ہوتی ہے۔ کلی کے ہاتھ میں کچھ عجیب سی ٹھنڈک تھی جو میری ہڈیوں تک میں اُتر گئی اور میں کانپنے لگا اور میں وہاں سے بھاگ آیا۔ پھر میں داتا کے پاس گیا اور جب واپس ہسپتال کے دروازے پر آیا تو وہ پہلے دن والی مس ادھ کھلے دروازے سے لگی کھڑی تھی اس نے مجھے اپنے پاس بُلایا اور بولی۔ کلی نے تم کو سلام بولا ہے۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ کلی تو لاہور میں آ کر میم ہو گئی ہے۔ سلام بولنے لگی ہے۔ مس نے میرا ہاتھ بڑی سختی سے پکڑ لیا۔ بولی۔ دیکھو۔ کلی نے تم کو آخری سلام بولا ہے۔ میں وہاں سے پاگلوں کی طرح بھاگا۔ میرے پیچھے چوکیدار بھاگنے لگا۔ چوکیدار کے پیچھے مس بھاگنے لگی۔ اور میاں جی۔ جب میں کلی کے پاس پہنچا تو اسے وہاں سے کہیں اور لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور مہترانیاں آئی ہوئی تھیں اور آس پاس

کی عورتوں نے کروٹیں بدل لی تھیں۔ مہترانیوں نے مجھے روکا چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا مگر پھر مس آ گئی۔ اس نے بتایا کہ یہ کلی کا گھر والا ہے۔ میں نے کلی کے منہ پر سے کپڑا ہٹایا تو میاں جی میں نے دیکھا کہ کلی مر گئی ہے۔ اس کے اُوپر کے ہونٹ پر کہیں کہیں خون جم گیا تھا۔ اور اس کی ناک میں مسوں نے روئی دے دی تھی۔ اس کی آنکھوں پر بھی کسی نے ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ اس کا ڈاٹھا بھی کسی نے نہیں باندھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی کہے گی "دیکھ غفورے ــــــ" پر میاں جی۔ وہ تو مر گئی تھی۔ مس نے مجھے میرا بچہ دکھایا! ایسا لگتا تھا کلی سمٹ کر بالکل ننھی سی ہو گئی ہے۔ مس بولی "تم کلی کو دفن کرا آؤ۔ پھر آ کر لے لینا" پھر جب لاش کو ہسپتال سے باہر لایا گیا تھا تو میں نے اسے یوں اٹھا لیا جیسے بچّے کو اٹھاتے ہیں۔ میرے ہر قدم پر کلی کی چوڑیاں بج اٹھی تھیں میاں جی۔ پہلے تو جی چاہا کہ انہیں توڑ ڈالوں۔ پھر جب میں نے کلی کو زمین پر لٹایا اور اس کی کلائی دیکھی تو وہ بڑی اچھی لگ رہی تھیں میں وہاں سڑک پر بیٹھ گیا اور ساری رات بیٹھا رہا۔ پولیس والوں نے ایک بار پوچھا تو میں نے سچ سچ بتا دیا اور وہ بولے "خدا کسی کو غریب نہ کرے" ایک دو بار تو جی چاہا میاں جی کہ وہیں پنجوں سے زمین کھود کر کلی کو سڑک کنارے دفن کر دوں پر جنازہ بھی تو پڑھنا تھا۔ صبح کو اللہ نے آپ کو بھیج دیا۔ آپ نہ آتے تو میں کلی کو یوں اٹھائے پھرتا جیسے بندریا اپنے مرے ہوئے بچّے کو چمٹائے پھرتی رہتی ہے۔ بس یہ بات ہے میاں جی"

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی اور سر کو جھٹک کر پگڑی کے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور پھر یوں بولا جیسے ایک ضروری بات کہنا بھول گیا تھا "کلی کو مجھ سے بڑا پیار تھا میاں جی۔ میں عمر میں اس سے کتنا بڑا ہوں پر وہ سب سے لڑ کر میرے پاس آ گئی تھی اور میں نے بھی سب سے لڑ کر اس سے شادی کر لی۔ ہم نے ساری دنیا سے لڑ کر پیار کیا تھا میاں جی"

پھر وہ ذرا دیر کو کچھ سوچ کر میاں سیف الحق کے قدموں سے لپٹ گیا اور بولا "میں آپ کے سامنے کیسی باتیں کرنے لگا ہوں۔ میں نے تو ساری باتیں کر دیں آپ کے سامنے۔ آپ بھی کیا کہیں گے۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے میاں جی؟"

میاں سیف الحق نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور رومال سے منہ صاف کر کے باہر

چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے اور بولے "غسالن آگئی ہے۔ کفن بھی آگیا ہے۔ قبر کے لئے بھی شفقت کہہ آیا ہے۔"

غفورا ان کے قریب آیا اور بچّے کے سے بھولپن سے بولا "غسل ہو جائے میاں جی تو ایک بار میں کلی کو دیکھوں گا۔"

اور میاں سیف الحق منہ میں رومال ٹھونس کر باہر چلے گئے۔

پھر جب وہ آئے تو ان کے ہاتھوں سے عطر خس اور کافور کی بو آرہی تھی غسل دیا جا چکا تھا۔ وہ غفورے سے کچھ نہیں بولے۔ بس کمرے میں آئے تو وہ میز پوش کے ایک کونے کو ہاتھ پر پھیلائے کڑھے ہوئے پھول دیکھ رہا تھا۔ اس نے میاں سیف الحق کو دیکھا تو اُٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے پاس آیا اور بولا "میاں جی میں آپ کو یہ تو بتانا بھول ہی گیا تھا کہ کلی بڑا اچھا کشیدہ کاڑھتی تھی۔" میاں جی کچھ بولے بغیر واپس جانے لگے اور غفورا ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پھر دروازے پر رُک کر بولا "آجاؤں میاں جی؟"

"تم سے کون پردہ کرے گا بھئی؟" وہ بولے اور آگے بڑھ گئے۔ غفورا ان کے پیچھے تھا۔

صحن میں بہت سی عورتیں جمع تھیں اکثر زار زار رو رہی تھیں۔ چند ایک طرف بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں اور جب غفورا اندر گیا تو اس سے کسی نے پردہ نہیں کیا۔ اس کے پہنچتے ہی رونے میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ سب سے پہلے میاں جی نے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر غسالن کی طرف بڑھایا مگر وہ سُرخ سُرخ آنکھیں مل کر بولی "نہیں میاں جی۔ ایک دن مجھے بھی مرنا ہے، کیا خبر اسی طرح سڑک کنارے دم نکل جائے۔ نہیں جی۔ میں نہیں لوں گی۔"

"سڑک کنارے!" میاں جی کی بیوی کی چیخیں نکل گئیں "میرے حامد کی طرح۔"

اور میاں سیف الحق بھی عورتوں کی موجودگی سے بے پروا ہو کر ٹوٹ کر رو دیئے۔ پھر انہوں نے رومال کو منہ میں ٹھونسا اور غفورے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے رومال نکالا اور بولے "میرے مولا کی دُنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی سڑک کنارے مر گیا پر یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اسے اچھا کفن دفن مل گیا۔

تم کہتی ہو حامد برسوں پہلے مرا تھا۔ میں تو کہتا ہوں وہ آج مرا ہے اور اس کا جنازہ یہ ہمارے سامنے رکھا ہے۔"

عورتیں پھر زور زور سے رونے لگیں۔

غفورا چپ چاپ کھڑا کلی کی لاش پر بچھی ہوئی ریشمی گلابی چادر کو ہوا کے غیر محسوس جھونکوں میں ہلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میاں جی کی بیوی نے اچھی طرح رو لینے کے بعد چادر ایک طرف سے اٹھائی کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے کلی کے چہرے پر سے کفن سرکا دیا اور غفورے کی طرف دیکھنے لگیں۔

سب عورتیں غفورے کی طرف دیکھنے لگیں۔

میاں سیف الحق نے بھی گھبرا کر غفورے کو دیکھا اور بولے "کیوں میاں۔ پہچانا نہیں کیا۔ یہ میرا حامد ہے۔ یہ تمہاری کلی ہے۔"

غفورے کی آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسو بھی جیسے سوکھ گئے تھے، اور دیر تک پلکیں جھپکے بغیر کلی کے چہرے کو دیکھتا رہا اور عورتیں بالکل خاموش ہو گئیں۔

پھر غفورے کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے کلی کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میاں جی کی بیوی بولیں "نہ نہ۔ ایسا نہیں کرتے۔ بیوی کے مرنے کے بعد اب تم اس کے محرم نہیں رہے۔ تمہارا تو اس پلنگ کو چھونا تک گناہ ہے۔"

غفورے پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ ذرا دیر تک جھکا ہوا ہاتھ بڑھائے یوں کھڑا رہا جیسے منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر وہ سیدھا ہو گیا اور کلی کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے رکھی۔

اچانک میاں سیف الحق نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور بولے۔

"روؤ۔ خوب روؤ۔ کھل کر روؤ۔ تم روؤ گے نہیں تو مر جاؤ گے تمہارے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ تمہیں سکتہ ہو جائے گا۔ حامد مرا تھا تو مجھے بھی ایسا ہو گیا تھا۔ یوں سمجھو کہ یہ چھ برس میں نے سکتے کی حالت میں گزارے۔ میں آج رویا ہوں تو جیسے نئی زندگی پائی ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں میاں جی۔" غفورا آہستہ سے بولا۔ پھر وہ چلنے لگا۔ وہ صحن کے اس کونے میں جا کر رُک گیا جہاں کلی کو غسل دیا گیا تھا۔ اس نے مجرموں کی طرح میاں سیف الحق کی طرف دیکھا۔ پھر جھکا۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے چُنے اور جیب میں ڈال لئے۔

اور عورتیں یوں ایک دم کڑک کڑک کر رونے لگیں کہ باہر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے اور گلی میں کھڑے ہوئے لوگ بھی ایک بار تو دہل کر رہ گئے۔

اور جب غفورا چوڑیوں کے ٹکڑوں کو جیب میں ڈالے واپس آ رہا تھا تو میاں سیف الحق نے کہا "سب بیبیاں ایک طرف چلی جائیں۔ میں فتویٰ دیتا ہوں کہ غفورا اپنی بیوی کی میت کو چھو سکتا ہے۔"

"نہ چھو سکا تو پاگل ہو جائے گا" انہوں نے قریب کھڑی ہوئی بیٹی کے کان میں سرگوشی کی۔

غفورا اسی سکتے کے عالم میں آگے بڑھا۔ کلی کے چہرے پر جھک گیا۔ اس کے چمکتے ہوئے زرد ماتھے پر سے ایک بال ہٹا کر اوپر کے بالوں میں ملا دیا اور بجائے اس کے کہ کلی کو مخاطب کرتا۔ بولا "دیکھ غفورے ــــــ"

پھر وہ اسی طرح خشک آنکھیں اور زرد چہرہ لئے باہر چلا گیا۔

اور میاں جی بولے "مجھے تو اب اس بدنصیب کی فکر پڑ گئی ہے۔"

جب کلی کا جنازہ اٹھا تو اس کے ساتھ بہت بڑا ہجوم تھا۔ بہت بارونق نماز جنازہ پڑھی گئی۔ نہایت خوبصورت قبر تیار ہو چکی تو غفورے نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا نکال کر قبر پر رکھ دیا۔

اور میاں سیف الحق لوگوں سے کہہ رہے تھے "مجھے حامد کے کفن دفن کا موقع ملتا تو میں اس سے زیادہ اور کیا کرتا۔ میں نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

میاں سیف الحق جب قبرستان سے پلٹے تو ایک عقیدت مند ہجوم ان کے ہمراہ تھا۔ ہر شخص کی زبان پر میاں جی کی خدا ترسی اور نیک نفسی کے قصے تھے اور سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ اس چودھویں صدی میں بھی آدمیت مری نہیں۔ ابھی اس میں زندگی کی ایک رمق باقی ہے اور اس رمق کا نام میاں سیف الحق ہے۔

میاں سیف الحق یہ باتیں سنتے تو گھبرا جاتے "ارے بھئی میں کس لائق ہوں" وہ احتجاج کرتے "بندہ کس لائق ہے۔ یہ تو توفیق کی بات ہے اور توفیق دینے والا میرا مولا ہے،

یہ تو سب میرے مولا کا احسان ہے دوستو۔"

پھر ان کی آنکھوں میں عجیب چمکتے دمکتے سے آنسو آجاتے اور وہ ایک لمبی گہری سانس لے کر کہتے۔"میں نے ایک مسکین بی بی کو نہیں دفنایا۔ میں تو آج چھ برس کے بعد اپنے حامد کو دفنا کے آرہا ہوں۔ میں تو ہر محرّم الحرام میں اس تربت پر فاتحہ پڑھنے اور پانی چھڑکنے آؤں گا۔" اور لوگ ان کے چہرے کے اردگرد ہالا اُبھرتا ہوا دیکھنے لگتے۔

اپنی گلی میں آکر میاں سیف الحق نے لوگوں کو رخصت کیا۔ چند بزرگوں کو وہ بیٹھک میں لے آئے اور پھر اچانک بولے۔"غفورا کہاں ہے؟"

بیٹھک میں چاروں طرف نظریں دوڑا کر وہ گلی میں آگئے اور بلند آواز میں جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔"ارے بھئی غفورا کدھر گیا؟"

وہ گلی کے اس پار سڑک تک قریباً دوڑتے چلے گئے اور انہیں اس حالت میں دیکھ کر گھروں کو جاتے ہوئے لوگ ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔"جانے وہ غفورا کہاں گیا؟" میاں جی بولے۔

"ارے ہاں" لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا۔"وہ تو سارے رستے نظر نہیں آیا۔"

واپس آکر وہ سیدھے زنان خانے میں چلے گئے اور بولے۔"جانے وہ غفورا کہاں غائب ہو گیا۔"

لیکن ان کی بیوی نے سوال کا جواب سوال میں دیا۔"اب مجھے کب لے چلیں گے قبر دکھانے؟"

"لے چلیں گے۔" میاں سیف الحق بولے۔

اور دوسرے روز وہ اپنی بیوی، تینوں بیٹوں اور چاروں بیٹیوں کے ہمراہ قبر دیکھنے گئے۔

کلی کی رسم قل بھی ادا ہوئی۔ چالیسویں تک ہر جمعرات کو محلّے کی مسجد کے امام صاحب کو دعوت پر بھی بلایا اور فاتحہ پڑھوائی۔ پھر چالیسواں بھی ہوا اور اس روز حامد کی تصویر کو اس کی بہنوں نے ہار پہنائے۔

اور اس بہت بڑے نشیب کے بعد میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار لک چھری چمکتی ہوئی سڑک بن گئی جو حدِ نظر تک خطِ مستقیم میں جاتی تھی اور جس کے دونوں طرف قد آور درخت سایہ کیے کھڑے رہتے تھے۔ وہ اس سڑک پر پھر سے کچھ ایسی بے تکلفی اور روانی سے چلنے لگے جیسے انسان کھانا کھاتے وقت چاہے بات جیلیاں والا باغ کی کر رہا ہو مگر نوالہ سیدھا منہ کو جاتے۔ اب اس سڑک پر وہ فصیل بھی نہیں اُبھرتی تھی جس کے پاس کبھی کبھی ٹھٹک کر وہ خلا میں گھورتے رہ جاتے تھے۔ اب حدِ نظر تک مطلع صاف تھا۔

یہ کوئی سال بھر کا ذکر ہے کہ میاں سیف الحق "الصّلوٰۃ خیر من النوم" کی آواز پر جاگے۔ اور نیلا رومال کندھے پر رکھ کر مسجد کی راہ لی۔ صندل کی تسبیح پر استغفار کا ورد کرتے ہوئے پلٹے۔ شریف چرسی کی دکان سے بچ کر نکلے اور گھر آ گئے۔ قرآن شریف کے چند رکوع، دعائے گنج العرش اور قصیدہ بردہ پڑھے' اخبار والے نے اخبار گول کر کے اسے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے اندر پھینک دیا اور بولا "السلام علیکم میاں جی"

سینے پر چھو کر کے میاں سیف الحق نے کہا۔ "آ گئے میاں؟ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" اور اخبار اٹھانے کو اٹھے۔

اچانک ایک بار پھر آواز آئی۔ "السلام علیکم میاں جی۔"

"آ گئے میاں؟" انہوں نے عادتاً کہا اور وعلیکم السلام کہنے ہی کو تھے کہ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے اس پار انہوں نے کچھ یوں آنکھیں سکیڑ کر دیکھنا شروع کیا جیسے ان کی نظروں کو کسی نے کس کر تان لیا ہے۔

"میاں جی" پھر آواز آئی۔

اور میاں سیف الحق نے اس دوران میں پہلی بار آنکھیں جھپکیں اور دروازے کی طرف لپکے۔ "آ جاؤ بھئی۔ آ جاؤ۔ سناؤ۔ کہاں رہے تم؟ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں تو اس روز تمہیں گلی گلی پوچھتا پھرا اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ آؤ اندر آ جاؤ۔ کمال ہے بھئی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم ——"

غفورا اندر آ گیا۔ اس نے ایک میلی سی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ سر پر کھدر کی ایک پرانی

چیکٹ ٹوپی تھی۔ آنکھیں بہت پیچھے ہٹ گئی تھیں اور بھووں اور گالوں کی ہڈیاں غیر فطری طور پر اُبھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ناک جھک آئی تھی۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور بالکل کھچڑی ہو رہی تھی۔ ہونٹ آپس میں کچھ یوں پیوست تھے جیسے الگ ہوتے تو اُن سے خون بہنے لگے گا۔ وہ میاں سیف الحق کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے میں آیا اور وہیں جا کر کھڑا ہو گیا جہاں بیٹھ کر اس نے میاں جی کو اپنی ساری کہانی الف سے یے تک سُنا ڈالی تھی۔

میاں سیف الحق غفورے کو دیکھتے ہوئے بھی خلا میں گھورتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ بھی وہیں جا کھڑے ہوتے جہاں بیٹھ کر انہوں نے غفورے کی کہانی سنی تھی۔ پھر میاں جی بیٹھے تو غفورا بھی بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے نیچے تازہ اخبار پڑا تھا۔ اور سامنے میز پر دھرے ہوتے رحل میں قرآن شریف، دعائے گنج العرش اور قصیدہ بردہ رکھے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے غفورے نے جو کہانی آج سے ایک سال پہلے شروع کی تھی وہ اب تک جاری ہے اور اس شدت سے جاری ہے کہ وہ جس پہلو سے بیٹھے تھے اسی پہلو سے جم کر رہ گئے ہیں۔

"ہم تو سمجھتے تھے۔" میاں سیف الحق بولے "کہ تم ہمیں بھول بھال گئے ہو گے۔"

"میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں میاں جی"۔ غفورا بولا "جب تک میں کلی کو نہیں بھولتا۔ آپ کو بھی نہیں بھولوں گا۔ اور میں کلی کو تو عمر بھر نہیں بھول سکوں گا میاں جی۔"

ذرا سے وقفے کے بعد غفورا بولا "میاں جی۔ آپ کتنے نیک آدمی ہیں اور میں کتنا خود غرض آدمی ہوں۔ میں نے پہلی خود غرضی تو یہ کی کہ کلی دفن ہو گئی تو آپ سے ملا تک نہیں اور چلا گیا۔ ـــــ دوسری خود غرضی یہ ہے میاں جی کہ ـــــ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ ـــــ"

رُک کر اس نے آنکھیں ملیں اور بولا "مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کلی اب تک سڑک کنارے بے کفن پڑی ہے۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئے تم"۔ میاں جی نے پیار سے ڈانٹا "میں نے اس دن کہا تھا نا کہ کھل کر رو دو۔ نہیں تو پاگل ہو جاؤ گے۔"

"نہیں میاں جی"۔ غفورا بولا "پاگل کہاں ہوا ہوں۔ پاگل ہونا ہوتا تو اسی دن نہ ہو جاتا جب مری ہوئی کلی کی کلائیوں میں چوڑیاں بجی تھیں۔ میں سچ کہتا ہوں مجھے اس ایک سال میں

ایک دن بھی تو ایسا نہیں بِلا جب کلی کی یاد نے مجھے گالی نہ دی ہو اور یہ نہ کہا ہو کہ دیکھ غفورے۔ مَیں تو اب تک سڑک کنارے چادر میں لپٹی رکھی ہوں۔"

"تمہیں کچھ ہو گیا ہے بھئی۔" میاں جی نے پریشان ہو کر کہا۔

"میاں جی" اب غفورے کے آنسو آج سے ایک برس پہلے کی طرح بہنے لگے اور اس کی آواز بھرانے اور گھٹنے لگی "کلی کو مجھ سے بڑا پیار تھا میاں جی۔ مَیں عمر میں اس سے کتنا بڑا تھا پر وہ سب سے لڑ کر میرے پاس آگئی تھی۔ ہم نے ساری دُنیا سے لڑ کر آپس میں پیار کیا تھا۔ پر مَیں کیسا برا ہوں کہ میں اس کے جنازے پر ایک پیسہ بھی تو نہ لگا سکا۔ مَیں نے کلی کے مرنے کے بعد اس کا تو کوئی حق ادا نہ کیا نا میاں جی۔ مَیں نے اس ایک سال میں بڑی محنت کی۔ مَیں بیمار بھی ہو گیا۔ مَیں ہسپتال میں بھی پڑا رہا۔ پر جو کچھ مجھ سے ہو سکا وہ کیا۔ مَیں نہیں جانتا آپ نے کلی کے جنازے پر کتنا خرچ کیا تھا۔ بہت کیا ہو گا کیونکہ آپ نے تو اسے بالکل اپنا بنا لیا تھا۔ اگر میں خود اس کے جنازے پر خرچ کر سکتا تو ———" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالے۔ انہیں فرش پر رکھ دیا اور بولا "تو اس سے زیادہ تو کیا کرتا کچھ کم ہی کرتا۔"

لمحہ بھر کو وہ خاموش رہا۔

میاں جی بھی خاموش رہے۔

کہیں اندر سے کلاک کی ٹک ٹک کی دبی دبی آواز آنے لگی۔

پھر وہ بولا "میاں جی۔ یہ آپ لے لیجئے۔"

میاں سیف الحق تڑپ کر اُٹھ کھڑے ہوتے۔

"نہیں میاں جی" غفورا بھی اُٹھ کھڑا ہُوا "میں آپ کو دُکھ دینے نہیں آیا۔ یہ رقم آپ لے لیجئے۔ آپ لے لیں گے تو میرے دل کو تسلی ہو گی۔ میں سمجھوں گا میں نے کلی کے کفن دفن کا سامان خود کیا۔ کلی بھی مجھے گالیاں نہیں دے گی اور اس کی رُوح بھی خوش ہو گی۔ لے لیجئے میاں جی۔"

میاں سیف الحق جو اس دوران میں ہانپنے لگے تھے۔ گرج اٹھے "تو کیا میں نے تم سے کوئی سودا کیا تھا؟ لے جاؤ یہ روپے۔ کیا میں تمہارے ان چند روپوں کا بھوکا ہوں؟ کیا تم نے

مجھے اپنی طرح ——" اور انہوں نے نوٹ اُٹھا کر غفورے کی طرف پھینک دیئے۔ یہ نوٹ ایک ایک کر کے فرش پر بکھر گئے اور غفورا خاموش کھڑا رہا۔

پھر جب اس نے دیکھا کہ میاں سیف الحق کانپنے بھی لگے ہیں تو وہ آہستہ سے بولا "میاں جی۔ دیکھئے، خفا نہ ہوجیے۔ آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ میں ایسا کمینہ نہیں ہُوں کہ اس احسان کو بھول جاؤں۔ پر بات یہ ہے میاں جی کہ آپ نے تو کلی کی جگہ حامد میاں کو دفن کیا تھا۔ اور میری کلی تو وہیں سڑک کنارے بے کفن پڑی رہ گئی۔ ان روپوں کو چاہے آپ نالی میں پھینک دیجئے پر میں نے تو آج ہی اپنی کلی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا ہے میاں جی۔"

بابا نورُ

"کہاں چلے بابا نور؟" ایک بچے نے پوچھا۔
"بس بھئی یہیں ذرا ڈاک خانے تک" بابا نور بڑی ذمہ دارانہ سنجیدگی سے جواب دے کر آگے نکل گیا۔
اور سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
صرف مولوی قدرت اللہ چپ چاپ کھڑا بابا نور کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولا "ہنسو نہیں بچو۔ ایسی باتوں پر ہنسا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بے پرواہ ہے۔"
بچے خاموش ہو گئے اور جب مولوی قدرت اللہ چلا گیا تو ایک بار پھر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
بابا نور نے مسجد کی محراب کے پاس رُک کر جوتا اتارا ننگے پاؤں آگے بڑھ کر محراب پر دونوں ہاتھ رکھے اسے ہونٹوں سے چُوما، پھر اسے باری باری دونوں آنکھوں سے لگایا۔ اُلٹے قدموں واپس ہو کر جوتے پہنے اور جانے لگا۔
بچے یوں اِدھر اُدھر کی گلیوں میں کھسکنے لگے جیسے ایک دوسرے سے شرما رہے ہیں۔
بابا نور کا سارا لباس دھلے ہوتے سفید کھدر کا تھا۔ سر پر کھدر کی ٹوپی تھی جو سر کے بالوں کی سفیدی کی وجہ سے گردن تک چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سفید داڑھی کے بال تازہ تازہ کنگھی کی وجہ سے خاص ترتیب سے اس کے سینے پر پھیلے ہوتے تھے۔ گورے رنگ میں زردی نمایاں تھی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ بالکل مصنوعی معلوم ہوتی تھیں۔

لباس، بالوں اور جلد کی اتنی بہت سی سفیدی میں یہ دو کالے بھونرا نقطے بہت اجنبی سے لگتے تھے۔ لیکن یہی اجنبیت بابا نور کے چہرے پر بچپنے کی سی کیفیت طاری رکھتی تھی۔ بابا نور کے کندھے پر سفید کھدر کا ایک رومال تھا جو لوگوں کے ہجوم سے لے کر مسجد کی محراب تک تین چار بار کندھا بدل چکا تھا۔

"ڈاک خانے چلے بابا نور؟" دکان کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔ جیتے رہو۔" بابا نور نے جواب دیا۔

پاس ہی ایک بچہ کھڑا تھا۔ تڑاک سے تالی بجا کر چلایا۔ "آہا ہا۔ بابا نور ڈاک خانے چلا۔"

"بھاگ جا یہاں سے۔" نوجوان نے بچے کو گھُرکا۔

اور بابا نور جو کچھ دور گیا تھا۔ پلٹ کر بولا۔ "ڈانٹتے کیوں ہو بچے کو۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ڈاک خانے ہی تو جا رہا ہوں۔"

دُور دُور سے دوڑ دوڑ کر آتے ہوئے بچے یہاں سے وہاں تک بے اختیار ہنسنے لگے اور بابا نور کے پیچھے ایک جلوس مرتب ہونے لگا مگر آس پاس سے کچھ نوجوان لپک کر آئے اور بچوں کو گلیوں میں بکھیر دیا۔

بابا نور اب گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔ پگڈنڈی مینڈ مینڈ جاتی ہوئی اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں اتر جاتی تھی تو بابا نور کی رفتار میں بہت کمی آجاتی۔ وہ گندم کے نازک پودوں سے پاؤں، ہاتھ اور چولے کے دامن بچاتا ہوا چلتا۔ اگر کسی مسافر کی بے احتیاطی سے کوئی پودا پگڈنڈی کے آر پار لیٹا ہوا ملتا تو بابا نور اسے اٹھا کر دوسرے پودوں کے سینے سے لپٹا دیتا۔ اور جس جگہ سے پودے نے خم کھایا تھا اسے کچھ یوں چھوتا جیسے زخم سہلا رہا ہے۔ پھر وہ کھیت کی مینڈ پر پہنچ کر تیز تیز چلنے لگتا۔

چار کسان پگڈنڈی پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ ایک کسان لڑکی گندم کے پودوں کے درمیان سے کچھ اس صفائی کے ساتھ درانتی سے گھاس کاٹتی پھر رہی تھی کہ مجال ہے جو گندم کے کسی پودے پر خراش آجائے۔ بابا نور ذرا سا رُک کر لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ گھاس

کی دستی کاٹ کر ہاتھ کو پیچھے لے جاتی اور گھاس کو پیٹھ پر لٹکتی ہوئی گٹھڑی میں ڈال کر پھر درانتی چلانے لگتی۔

"بھئی کمال ہے۔" بابا نور نے دُور ہی سے کسانوں کو مخاطب کیا۔ "یہ لڑکی تو بالکل مداری ہے۔ اتنی لمبی درانتی چلا رہی ہے۔ چپے چپے پر گندم کا پودا اُگ رہا ہے۔ پر درانتی گھاس کاٹ لیتی ہے اور گندم کو چھوتی تک نہیں۔ یہ کس کی بیٹی ہے؟"

"تو کس کی بیٹی ہے بیٹا؟" بابا نور نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو ایک کسان کی آواز آئی۔ "میری ہے بابا۔"

"تیری ہے؟" بابا نور کسانوں کی طرف جانے لگا۔ "بڑی سیانی ہے، بڑی اچھی کسان ہے۔ خدا حیاتی لمبی کرے۔"

"آج کہاں چلے بابا؟" لڑکی کے باپ نے پوچھا۔

"ڈاک خانے؟" دوسرے نے پوچھا۔

"ہاں!" بابا نور ان کے پاس ذرا سا رُک کر بولا۔ "میں نے کہا پوچھ آؤں شاید کوئی چٹھی وٹھی آئی ہو۔"

چاروں کسان خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ایک طرف ہٹ کر پگڈنڈی چھوڑ دی اور بابا نور آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ کھیت کے پرلے سرے پر پہنچا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی۔ "لسی پیو گے بابا نور؟"

بابا نور نے مڑ کر دیکھا اور گاؤں سے نکلنے کے بعد پہلی بار مسکرایا۔ "پی لوں گا بیٹا۔" پھر ذرا سا رُک کر بولا۔ "پر دیکھ ذرا جلدی سے لا دے۔ ڈاک کا منشی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے، چلا نہ جائے۔"

لڑکی نے گھاس کی لٹکتی ہوئی گٹھڑی کندھے سے اُتار کر وہیں کھیت میں رکھی۔ پھر وہ دوڑ کر مینڈ پر اُگی ہوئی ایک بیری کے پاس آئی، تنے کی اوٹ میں پڑے ہوئے برتن کو خوب چھلکایا۔ ایلومونیم کا کٹورا بھرا اور لپک کر بابا نور کے پاس جا پہنچی۔

بابا نور نے ایک ہی سانس میں سارا کٹورا پی کر رومال سے ہونٹ صاف کئے بولا۔ "تیرا

نصیبہ اسی لسّی کی طرح صاف ستھرا ہو بیٹا" اور آگے بڑھ گیا۔

مدرسے کے برآمدے میں ڈاک کا منشی بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھا اپنے روزانہ کے فارم بھی پر کر رہا تھا اور دیہاتیوں کو معلومات سے بھی مستفید کر رہا تھا "میرا سالا وہاں کراچی میں چپراسی کا کام کرتا تھا۔ جب وہ مرا ہے تو مجھے فاتحہ کے لئے کراچی جانا پڑا۔ بات یہ ہے دوستو کہ ایک بار کراچی ضرور دیکھ لو چاہے وہاں گدھا گاڑی میں جتنا پڑے۔ اتنی موٹر کاریں ہیں کہ ہمارے گاؤں میں تو اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوں گی۔ ایک ایک موٹر پر وہ عورت ذات بیٹھی ہے کہ اللہ دے اور اللہ ہی لے۔ بندہ نہ لینے میں ہے نہ دینے میں۔ بندوں کو پریوں سے کیا لینا دینا۔ اللہ کی قدرت یاد آجاتی ہے، نماز پڑھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ایک سیٹھ کہہ رہا تھا کہ بس ایک اور بڑی لام لگ جائے تو کراچی ولایت بن جائے گی۔ کہتے ہیں کتنی بار لام لگنے لگی پر لگتے لگتے رہ گئی۔ کوئی نہ کوئی بیچ میں ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ کہتے ہیں لام میں لوگ مریں گے۔ کوئی پوچھے لام نہ لگی تو جب بھی تو لوگ مریں گے۔ لام میں گولے سے مریں گے۔ ویسے بھوک سے مر جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا"

"ٹھیک ہی تو ہے" ایک دیہاتی بولا "پر منشی جی پہلے یہ بتاؤ کہ لفافہ اکنّی کا کب کرو گے"

منشی نے اسے کچھ سمجھانے کے لئے سامنے دیکھا تو اس کی نظر ایک نقطے پر جیسے جم کر رہ گئی، اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بجھی ہوئی آواز میں بولا "بابا نور آ رہا ہے"

سب لوگوں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر سب کے چہرے کملا گئے۔

بچے مدرسے کے دروازوں اور کھڑکیوں میں جمع ہو کر "بابا نور۔ بابا نور" کی سرگوشیاں کرنے لگے اور منشی نے انہیں ڈانٹ کر اپنی اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

سفید براق بابا نور سیدھا مدرسے کے برآمدے کی طرف آ رہا تھا، اور لوگ جیسے سہمے جا رہے تھے۔

برآمدے میں پہنچ کر اس نے کہا "ڈاک آ گئی منشی جی؟"

"آ گئی بابا" منشی نے جواب دیا۔

"میرے بیٹے کی چٹھی تو نہیں آئی؟" بابا نے پوچھا۔

"نہیں بابا" منشی بولا۔

بابا نور چپ چاپ واپس چلا گیا۔ دُور تک پگڈنڈی پر ایک سفید دھبا رینگتا ہوا نظر آتا رہا اور لوگ دم بخود بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔

پھر منشی بولا "آج دس سال سے بابا نور اسی طرح آ رہا ہے، یہی سوال پوچھتا ہے اور یہی جواب لے کر چلا جاتا ہے، بے چارے کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ سرکار کی وہ چٹھی بھی تو میں نے ہی اسے پڑھ کر سنائی تھی جس میں خبر آئی تھی کہ اس کا بیٹا برما میں بم کے گولے کا شکار ہو گیا۔ جب سے وہ پاگل سا ہو گیا ہے۔ پر خُدا کی قسم ہے دوستو کہ اگر آج کے بعد وُہ پھر بھی میرے پاس یہی پوچھنے آیا تو مجھے بھی پاگل کر جائے گا۔"

آئینہ

یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بادل اس کے کوٹھے کی چھت پر بیٹھا دہاڑ رہا ہے۔ کڑک کے ساتھ گھڑے پر رکھا ہوا ایلومونیم کا کٹورا بج اٹھتا تھا کوٹھے کے عین وسط میں گڑے ہوئے چوکور چولہے میں اپلے جل رہے تھے۔ ایک طرف جھاڑ کی کڑوں کا ڈھیر رکھا تھا جنہیں وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ کر چولہے میں جھونکنے کی بجائے جیسے سجا رہی تھی دھواں چولہے سے نکل کر پہلے تو کوٹھے کی چار دیواری کے ساتھ گھومتا جیسے کسی جھری کو سونگھ رہا ہے۔ پھر دروازے کو بھی بند پا کر اور اس کی جھریوں میں سے تیز ہوا کی جھریوں کو گزرتا دیکھ کر وہ اوپر اٹھ جاتا اور چھت سے جیسے چمٹ کر رہ جاتا۔ گھی کا ننھا سا برتن جسے اس نے بلیوں کی زد سے بچانے کے لیے چھت کے ساتھ رسیوں کے ایک چھینکے میں لٹکا رکھا تھا، دھوئیں میں غائب ہو چکا تھا۔

ایک دم اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اولے گر رہے ہیں۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا، پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کانپتی ہوئی اٹھی اور دروازے کی زنجیر کھولی تو ہوا کے دھکے سے ایک کواڑ نے اس کے کلّے کی ہڈی پر جیسے تڑ سے تھپڑ مار دیا اور دو تین اولے بھی لڑھک آئے اس نے پورا زور لگا کر دروازہ بند کیا اور کلّے کو سہلاتی ہوئی واپس چولہے کی طرف جانے لگی۔ ابھی وہ بیٹھ بھی نہیں پائی تھی کہ کسی نے کواڑوں کو کوٹ ڈالا۔ ساتھ ہی کسی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "نشو ماسی۔ اے ماسی نشو!"

پلٹ کر نشو نے اب کے ذرا فاصلے سے ہاتھ بڑھا کر زنجیر کھول دی ایک نوجوان کو جیسے کسی نے اٹھا کر اندر پھینک دیا۔ بادل زور سے کڑکا اور نشو بولی "کہیں بجلی گری ہے"۔

نوجوان نے دروازہ دھڑاک سے بند کیا اور بولا۔" اولوں نے بالکل دھنک کے ڈال دیا ہے۔ سر پر جو بھی اولا گرا وہ گیند کی طرح یوں اوپر اچھل گیا۔ جیسے پھر سے بادل میں چلا گیا ہے۔ آج تو فرشتے تاک تاک کر مار رہے ہیں۔"

" اولا بڑی قاتل شے ہے۔" نشو بولی۔" اولوں میں گھر سے نہیں نکلتے جوار کے دانے کے برابر ایک اولا بھی کنپٹی پر پڑ جائے تو موت ہو جاتی ہے۔"

پھر وہ چولہے کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئی اور بہت سی جھانکڑیں توڑ کر چولہے میں بھر دیں۔ سردی سے سسیاتے ہوئے نوجوان نے ہاتھوں کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں سے گزارا اور کچھ کہنے ہی لگا تھا، کہ نشو بولی" کیسے آئے؟ کون ہے وہ کرموں والی؟"

نوجوان مسکرانے لگا۔ ہاتھ کو ایک بار پھر شعلے میں سے گزارا اور کہیں اندر سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر بولا۔" ادھر دکھنی محلے میں جو ــــــــ"

نشو نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لے کر اسے چٹائی کے ایک کونے کے نیچے رکھ دیا اور بولی۔" یہ دکھنی محلہ تو بالکل کوہ قاف ہے۔ یہاں سے وہاں تک پریاں ہی پریاں۔ پر نہیں میں ہاں کسی سے لو لگ جائے تو پر بھی لگ جاتے ہیں۔ رانی دھوبن کو دیکھا ہے؟ اڑتی پھرتی ہے کہ نہیں؟ یہ سب دلوں کے سودے ہیں۔ تو وہ کون ہے کرموں والی؟"

نوجوان بولا۔" وہ اپنے شجاعت خان کی بیٹی ہے نا؟"

بڑھیا پل بھر کے لیے سناٹے میں آگئی۔ ایک پاؤں کے تلوے کو یوں حرکت دی۔ جیسے چٹائی کے نیچے رکھے ہوئے نوٹ کو محسوس کر رہی ہے پھر چمٹا اٹھا کر جھانکڑوں کے چند ادھ جلے ٹکڑے آگے بڑھائے۔ پھر نوجوان کی طرف دیکھ کر بولی۔" بڑی والی کہ منجھلی والی؟"

" منجھلی والی۔" نوجوان بولا۔

" ہاں بڑی تو بیاہ گئی۔" نشو نے ایک اپلے کو چمٹے سے الٹ دیا۔

" بس وہی منجھلی والی۔" نوجوان نے مزید وضاحت کی۔

" جانتی ہوں۔" نشو بولی۔" عالم بی بی نام ہے"

" ہاں بس وہی عالی۔" نوجوان بولا۔" اسی عالی سے کہنا ہے کہ ملنا ہے قول لو ورنہ میں

پرسوں ترسوں تک دھتورا کھالوں گا۔"

"پہلے کوئی بات وات ہوئی؟"

"نہیں ماسی"

"کوئی کنکر ونکر مارا؟"

"نہیں ماسی۔ نہیں مار سکا۔ ہاتھوں سے ایک ہی کام تو ہوتا ہے۔ کنکر ماروں کہ دل پکڑ کر بیٹھوں؟"

"یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔" نشو نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو سو روپلے کا کام ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں ماسی یہ سو چھوڑ ہزار روپلے کا کام ہے۔ پر تیرے لیے تو چٹکیوں کا ہے تو نے تو ماسی، میں نے سنا ہے، چودھری شافے کی بیٹی کی ملاقات چودھری شافے کے مزارعے سے کرا دی تھی۔"

نشو بڑی آسودگی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور ران تک تہمد اٹھا کر گھٹنا کھجانے لگی، بولی، "سن بیٹا میں تو پانچ بھی نہ لیتی پر یہ موا دوزخ بھی تو بھرنا ہوتا ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "پچاس کے لگ بھگ ہوں پر ہاضمہ ایسا تیز ہے کہ اکٹھی چار پانچ روٹیاں نہ کھالوں تو چین نہیں پڑتا۔ خیر اب یہ بتا کر کچھ اور بھی کہنا ہے اس سے کہ بس دھتورا کھانے کی دھمکی دینی ہے۔ میرا مطلب ہے کہاں ملے؟"

"پہلے مانے تو۔"

"یہ تو مجھ سے کہہ رہا ہے؟" نشو نے تنک کر کہا۔ "مجھ سے؟ مانتی ہوں عالی بڑی کافر لڑکی ہے۔ میں نے ایسا حسن پچاس سال کی عمر میں اور کہیں دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔ بالکل موت ہے۔ پہلی بار دیکھو تو سن سے ہو جاتا ہے دیکھنے والا۔ پھر بدنام بھی نہیں ہے پھر وہ شجاعت خاں کی بیٹی ہے اور شجاعت خاں وہ آدمی ہے کہ اسے میری نیت کا پتہ چلے تو پوروں تک کتر کر چیلوں کے آگے ڈال دے۔ پر میں نے بھی تو دس اوپر بیس سال گزار دیئے انہی دلوں کے سودوں میں۔ خدا بخشے تیرے باپ کی ایسی یاری لگوائی تھی کہ اس کی قبر پر اب تک چراغ جلتا ہے۔ کون جلاتا ہے چراغ؟ یہ سب دلوں کے سودے ہیں بیٹا۔ لے اب صاف بتا۔"

نوجوان جس کی مسکراہٹ ایک لمحے کو بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ بولا "جاڑے کی رُت ہے ماسی۔ شام سے ساما گھر سو رہتا ہے۔ کہیں بھی مل جائیے۔ ادھر وہ نیئے آوے کے پاس جو پرانے آوے کا کھنڈر ہے تو وہیں سہی"۔

"بس ٹھیک ہے"، نشو بولی۔ "لا ہاتھ لا اپنا۔ پہنچے گی۔ خفتاں کی اذان کے ساتھ پہنچ جانا۔ میں اسے خود ہی لے آوں گی۔ نئی نئی ہے ناکہیں چوڑیاں چھنکاتی نہ آ نکلے۔ جا اب نکل چل۔ کوئی دیکھ لے گا تو سمجھ جائے گا۔ میرے پاس تو لوگ رات کو آتے ہیں، دن دہاڑے اور پھر ایسی رت میں تو صرف عاشق لوگ ہی گھروں سے نکل سکتے ہیں۔ جا بھاگ جا"۔

"تو پھر ماسی، میں پہنچوں آوے پر؟" اس نے رکتے ہوئے پوچھا۔

"ایک بار تک جو دیا"۔ نشو ناگواری سے بولی۔

نوجوان نے کواڑ کھولے اور چلا گیا۔ نشو نے دروازے پر آ کر باہر دیکھا بارش پھوار میں بدل چکی تھی دیواروں کے ساتھ اولوں نے حاشیے کھینچ رکھے تھے۔ صحن میں کہیں اکا دکا اولا باقی تھا۔ آسمان پر ایک جگہ سے بادل پھٹ گیا تھا۔

دروازے سے ہٹ کر وہ چٹائی پر آ بیٹھی۔ پانچ روپے کے نوٹ کو چٹائی کے ایک کونے سے نکال کر دوسرے کونے کے نیچے رکھا پھر وہاں سے نکال کر بازو والی جیب میں ڈال لیا کہنیاں کو گھٹنوں پر رکھ کر ہاتھ چولہے کی طرف بڑھا دیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ پل بھر کے بعد وہ چونک پڑی اور بڑبڑائی "ایک تو موئی نیند سوار رہنے لگی ہے ہر وقت"، اٹھ کر اس نے چولہے سے جھانکڑیں نکالیں ان پر کوزے سے پانی گرایا۔ ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا۔ اب پھوار بھی رک گئی تھی مگر نئے گھنے بادل نے دوپہر کو شام بنا ڈالا تھا۔ اس نے دروازے کے پہلو میں ایک کیل پر سے تالا اتارا اور باہر نکل کر کواڑ بند کرنے لگی تھی کہ گاڑھے دھوئیں کو بھی اپنے ساتھ باہر نکلتا دیکھ کر رک گئی "موا نکل جائے۔ رات بھر نتھنوں میں گھستا پھرے گا" پھر اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سارے دھوئیں کو اندر سمیٹ لے گیا اور نشو نے کواڑیوں بند کئے جیسے دھوئیں کو قید کی سزا دے رہی ہے۔

گلیوں میں اب تک تھوڑا تھوڑا پانی بہ رہا تھا۔ دونوں طرف مکانوں کے ساتھ ساتھ اولوں نے صفیں سجا رکھی تھیں۔ اور ننگے نیچے منہ میں اولے رکھے پانی اور کیچڑ میں بھاگے پھر

رہے تھے پکے مکانوں والیاں چھتوں پر سے اولے چن چن کر نیچے پھینک رہی تھیں اور اڑتی ہوئی نئی گھٹا کے تیور کچھ ایسے تھے جیسے جھولی میں اولے بھر رکھے ہیں اور مارے بوجھ کے جھکی چلی آ رہی ہے نشو ایک گلی میں سے گزری تو ایک اولا اس کے سر پر اس زور سے گرا کہ اس کی کھوپڑی تانبے کی ہوتی تو ٹن سے بج اٹھتی۔ اس نے چھت پر سے اولے سمیٹتی ہوئی ایک عورت کو گھور کر دیکھا اور بولی " اللہ نے دو آنکھیں دے رکھی ہیں تو انہیں کام میں لا۔ ذرا سوچ سمجھ کر پھینک"

عورت فوراً تڑاخ سے بولی۔ "مجھے کیوں راہ چلتے کاٹے لے رہی ہو؟ اولا آسمان سے آیا ہے۔ میں تو ادھر پرنالے کے پاس پھینک رہی ہوں"

نشو نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے تو ایک اور اولا اس کے کندھے کی ہڈی پر گرا اور پھر بادل اس زور سے کڑکا جیسے زمین کے بخیے ادھڑ گئے ہیں۔ گھٹا نے ایک دم اولوں بھری جھولی الٹ دی اور نشو سر پر دونوں ہاتھ رکھے بھاگنے لگی۔ موڑ پر وہ ایک دم پلٹی اور ایک کھلے دروازے میں گھس گئی۔ اولوں سے پٹا ہوا آنگن طے کر کے وہ کوٹھے کے اندر یوں جا گری جیسے کسی نے میلے میلے چکٹ چیتھڑوں کی گٹھڑی سر سے اتار کر دھپ سے زمین پر دے ماری ہے۔

"وارے یہ کون ہے؟" چولہے کے پاس سے ایک عورت کی آواز آئی۔

"میں ہوں" نشو بولی "میں نشو ہوں گوہراں"

گوہراں جس کے چہرے پر چولہے کے شعلے ناچ رہے تھے اور جس کی ناک میں ننھی سی سنہری کیل چنگاری کی طرح چمچا رہی تھی، یوں چونکی جیسے اسے کسی نے دھکا دے دیا ہے۔ وہ ذرا دیر تک نشو کو یوں دیکھتی رہی جیسے اسے نشو کے نشو ہونے پر یقین نہیں آ رہا۔ نشو کھسک کر اس کے قریب آنے لگی تو گوہراں تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور جب وہ بولی تو اس کے ساتھ بادل بھی گرجتا چلا گیا۔ "تو چلی جا یہاں سے جلدی سے نکل جا ورنہ میرا بیٹا آ کر تیری ہڈیاں توڑ دے گا۔ تو تو لعنت ہے سارے گاؤں کی۔ تو تو جس دیوار سے لگ کر کھڑی ہو جائے تو وہ دیوار بھی بدنام ہو جاتی ہے۔ اور یہ تو شریف آدمیوں کا گھر ہے۔ تو میرے ہاں کیسے آ ٹپکی"

"باہر اولے گر رہے ہیں گوہراں۔" نشو نے بے بسی سے کہا۔

"تو میں کیا کروں؟" گوہراں نے ایک قدم یوں اٹھایا جیسے نشو کو ٹھوکر مارنے چلی ہے۔

"اولے گر رہے تھے تو گھر سے نکلی ہی کیوں؟ کسی شکار پر چلی ہو گی"

"نہیں نہیں گوہراں۔" نشو نے لجاجت سے کہا، "میں تو ادھر وزیرے کی دوکان سے اکنی کی نسوار خریدنے نکلی تھی۔ بادل ذرا کھلنے کو تھا اس لیے میں نے کہا لے آئیں کہ نشہ نہ ٹوٹے پر یہ گھٹا شاید میری ہی تاک میں تھی۔ چندیا پر وہ تڑا تڑ اولے گرے ہیں کہ اگر سر پہ ہاتھ نہ رکھتی تو اولا تالو پر گر کر توے سے جا لگتا۔ گولیاں چل رہی ہیں آسمان پر سے۔ خدا کا قہر برس رہا ہے۔ ہمارے تمہارے گناہوں کا بدلہ مل رہا ہے۔ کھڑی فصلیں بھوسا بن کر رہ جائیں گی۔ دیکھو تو کیسا ڈھیر لگا ہے صحن میں۔ کروڑوں نہیں تو لاکھوں تو ہوں گے۔"

گوہراں چولہے کے پاس بیٹھ گئی اور بولی "مجھے باتوں میں نہ لگا۔ سچی بات کہوں میں تو ڈرتی ہوں تجھ سے، اور ایک میں ہی نہیں وہ ساری گاؤں والیاں ڈرتی ہیں جن کے دل میں ایمان کی رتی ہے۔ اب دیکھ، مانا کہ تو اولوں سے ڈر کر ادھر آئی پر کوئی تجھے یہاں سے نکلتا دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ مجھ بوڑھی بیوہ نے بھی کہیں سودا چکا لیا ہے۔ نہیں بی بی تو چلی جا یہاں سے۔ اب تو اولے بھی اکا دکا ہی گر رہے ہیں۔ میں اپنی چٹی چادر پہ داغ نہیں لگاؤں گی۔ مجھے قسم خداوند کریم کی۔ تو ہی بتا مجھے کتنی مدت کے بعد دیکھا ہے؟"

"تیرے بیٹے کی شادی پہ دیکھا تھا تجھے۔" نشو بولی

"اور میرے بیٹے کی شادی کو پانچ سال ہو گئے۔" گوہراں بولی "چار بچے بھی ہو گئے جب سے۔"

"ارے؟" نشو بولی "چار؟ مجھے تو دو تک کا پتہ چلا ہے۔ ایک بار بہو کو بھٹیارن کے ہاں دیکھا تھا۔ ایک بچہ بغل میں تھا۔ ایسا پھول سا کہ دور سے خوشبو آئے۔ اللہ رکھے بہو دکھائی نہیں دے رہی۔"

"میکے گئی ہے۔" گوہراں پہلی بار نرمی سے بولی۔

"گوہراں۔" نشو اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "وہ ہربنس کور کی بلور والی گولیاں یاد ہیں؟ ہم دونوں نے اس کی چوٹی کو ستون سے باندھ کر کیسی کیسی جیبیں بھر لی تھیں گولیوں سے۔ پھر جب اس کا باپ سنتو کھا سنگھ آ گیا تو ہم دونوں کو گردنوں سے پکڑ کر یوں اٹھا لیا تھا۔ جیسے ہم لڑکیاں نہیں مولیاں ہیں۔"

گوہراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "تُو تو ابھی تک شرارت کی باتیں کرتی ہے زیب النساء"
نشو بولی۔ "اور پھر سنتو کھے نے ہمیں پاؤں سے پکڑ کر الٹا لٹکا دیا تھا اور ہمیں جھٹک جھٹک کر ایک ایک گولی نکال لی تھی۔ یاد ہے؟"
"یاد ہے" گوہراں بولی۔ پھر اس نے نشو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں خاصی نرمی تھی "نشو تو کتنی اچھی تھی بچپنے میں تو میری کتنی پیاری سہیلی تھی پر نشو وہ عورتیں جن کا جوانی میں سہاگ لٹ جاتا ہے سب کی سب کنجیاں تو نہیں ہو جاتی تیری طرح۔ مجھے دیکھ دو برس کا بچہ گود میں تھا جب اس کا باپ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پر سچ بتا۔ وہ طاقچے پر قرآن شریف رکھا ہے۔ اس طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ دے، میری کوئی بدنامی سنی؟ ساری جوانی اس کوٹھے میں اس چولہے کے پاس بیٹھ کر گذار دی۔ اِدھر اپنی سہیلی بھاگاں کو دیکھ۔ شادی کے ایک مہینہ بعد مانگ کا سیندور دھل گیا اور کلائیوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ جب سے چکی پیسنے لگی ہے تو اب تک چکی ہی پیس رہی ہے نہ بٹیا نہ بیٹی۔ نہ چچا نہ تایا۔ خالی ڈھنڈار گھر میں بھتنی سی گھومتی رہتی ہے۔ پر اس پر کسی کی انگلی اٹھی؟ نہیں اٹھی نا؟ تو تیرے نصیبوں میں وہ کون سے پتھر پڑے تھے کہ اِدھر تیرا گھر والا سدھارا اُدھر تو نے کمر کی چادر کھول کر سر پر اوڑھ لی اور کمائی کرنے بیٹھ گئی۔ تیرا تو کمبخت شادی کرنے سے پہلے بھی کتنوں سے نام لگ چکا تھا شرم نہیں آتی تجھے؟ ذرا سی بھی شرم ہو تو چولہے میں سے مٹھی بھر انگارے اٹھا کر چبا لے۔ تف ہے تجھ پر"
گوہراں کچھ دیر کے لیے رکی۔ مگر نشو کو خاموش پا کر اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اب تو یہ حالت ہے تیری کہ تیرے کوٹھے کی چھت پر سے کوئی چڑیا بھی اڑ کر آئے تو لوگ کہتے ہیں کہ کسی کو ورغلانے آئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں وہ کون دل گردے والا مولوی ہوگا جو تیرا جنازہ پڑھے گا جانے گاؤں والے بے غیرتوں نے تجھے اب تک گاؤں سے نکال کیوں نہیں دیا"
نشو ایک دم کھڑی ہو گئی۔ "کسی کے سینگ اُگے ہیں جو مجھے میرے گھر سے نکالے۔ اپنا کوٹھا ہے۔ اپنا کھاتی ہوں۔ نہ کسی کے لینے میں ہوں نہ دینے میں، تُو بھی قرآن شریف کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ دے۔ باتیں تو چاہے کوئی لاکھ بنائے پر آج تک مجھے کسی ماں کے پوت نے پکڑا بھی ہے؟ تیری نیکی کی طرح میری بدی کا بھی ثبوت نہیں بی بی رانی۔ یوں بڑھ بڑھ کے باتیں

نہیں بناتے دلوں کے بھید خدا ہی جانتا ہے۔ اس نے تو ایک کنجری کو پیاسے کتے کو پانی پلانے کے بدلے میں بخش دیا تھا اور ایک اولیا کو ایک چیونٹی مارنے کے بدلے میں دوزخ میں بھیج دیا تھا اور جو کرتی بھی ہوں تو کچھ اپنا ہی بگاڑتی ہوں نا کسی کے در پر جا کر ٹکڑ گدائی نہیں کرتی۔ تجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ ادلوں سے بچنے کے لیے سر چھپانے آنکلی تھی۔ پر یہاں وہ گالیاں سنی ہیں کہ تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو نوچ کر ڈال دیتی۔ بڑی آئی وہاں سے پاک دامن حور بن کر۔ مانو گی نہیں پر جس سے تو نے پہلے شادی کی تھی۔ اس سے پہلے عشق کیا تھا کہ نہیں؟ اس کی یاد میں دوہے گائے تھے کہ نہیں؟"

گوہراں جواب تک دم بخود بیٹھی تھی۔ اس آخری بات پر چولہے میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی نکال کر بولی "میں باچھیں پھاڑ دوں گی بکواس کہیں کی"۔

نشو دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی۔ "سچی بات سے مرچیں لگ گئیں؟ سچ ہی تو کہہ رہی ہوں تجھے جو ایک ملا تیرا ہی ہو کے رہ گیا۔ ہمیں جو بھی ملا جُل دے گیا۔ کسی کا ہو جانے کے لیے سب سے ملے اور سب نے جُل دیا گھر والے نے بھی جُل دیا اب میں کبھی کبھار ایک آدھ کو جُل دے دوں تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ جیسا بوؤ گے دیسا کاٹو گے۔ تو چولہا جھونکتی ہے ہم دلوں کے سودے کرتے ہیں۔ تجھے شاید خبر نہ ہو۔ تیرے بیٹے کی چار ملاقاتیں تو یہ نشو کرا چکی ہے۔ تیری بہو بھی شادی سے پہلے میری منت کر کے تیرے لاڈلے سے عاشقیاں کماتی رہی ہے۔ کسی دھوکے میں نہ رہنا"

اب کے گوہراں نے ننگی ننگی گالیوں کا طومار باندھ دیا اور نشو کی طرف بڑھی۔ مگر نشو اولوں پر سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گلی میں پہنچ گئی۔ پھر اس نے گوہراں کی گالیوں کا جواب دینے کے لیے ننھی سی لڑکی کی طرح بن کر کہا۔ "بڑی اچھی لگ رہی ہے" اور یہ کہہ وہ گلی میں نکل گئی۔

رستے میں وزیرے کی دکان سے اس نے اکنی کی نسوار خریدی اور چار روپلے پندرہ آنے کی رقم جیب میں ڈال کر دکھنی گلی میں مڑ گئی۔

اور جب وہ شجاعت خان کی ڈیوڑھی میں پہنچی تو اس نے سر کی چادر کو ماتھے تک کھینچ لیا اور کچھ یوں بکل نکالا جیسے نماز پڑھنے چلی ہے۔ ڈیوڑھی سے نکل کر جب وہ صحن میں آئی تو اس

نے دیکھا کہ عالی سامنے کوٹھے کے دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے چنے چنگیر میں ڈالے انہیں ہتھیلیوں سے رگڑ رگڑ کر چھلکے اتار رہی ہے اور جب اس نے نشو کو دیکھا تو اس کا چہرہ یوں اچانک فق ہو گیا جیسے اسے زلزلہ محسوس ہوتے لگا ہے۔ دیر تک وہ چنگیر میں ہتھیلیاں ٹیکے بیٹھی رہی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ نشو آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہی ہے تو اس نے چنگیر ایک طرف رکھ دی اور خشک حلق کو تر کر کے بولی۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹی" کنکھیوں سے دائیں بائیں دیکھتی ہوئی اس کی طرف آنے لگی، "بات کیا ہوئی ہے، کوئی بات نہیں، وہ تو میں اس لیے آ گئی تھی کہ ذرا ——————" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اندر کواڑ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اس نے آہستہ سے پوچھا "تو اکیلی ہے بیٹی؟" اور یہ کہتے ہی نشو کی جھریاں یوں لٹک پڑیں، جیسے ان میں ریت بھر گئی ہے۔

عالی پیچھے ہٹ کر دوسرے کواڑ سے لگ گئی۔ اس کا چہرہ جو چنگیر پر جھکنے کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا، ایک دم نچڑ کر میلی میلی سفید دھجی بن کر رہ گیا۔ اس کے ادھ کھلے ہونٹ مرڑ چمڑے کی طرح سوکھ گئے۔ اگر اس کے کانوں میں چاندی کے آویزے اس کے دل کی دھڑکنوں کے تال پر لرز لرز نہ اٹھتے تو اس میں زندگی کے آثار کی تلاش مشکل ہو جاتی۔

نشو نے پاؤں پسار دیئے اور تہمد کو ران تک اٹھا کر گھٹنا کھجلانے لگی۔ "بات تو کوئی ایسی خاص نہیں بیٹی، میں نے کہا ذرا بھائی شجاعت خاں کو دیکھ لوں۔ برس گزر گئے۔ کبھی صورت ہی نظر نہیں آئی۔ وہ جب تم سے چھوٹی پیدا ہوئی تھی، نا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

عالی خاموش رہی۔

"بس اس وقت دیکھا اسے" نشو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہی کوئی سات آٹھ برس کی بات ہو گی۔ اس وقت تو بھی یہی سات آٹھ ہی کی ہو گی۔ تیری ماں تو میری ایسی پکی سہیلی تھی بیٹی، کہ ہم نے دوپٹے بدل لیے تھے کبھی زمانے میں، تیری ماں اور گوہراں اور بھاگاں اور میں، ہم سب اکٹھے کھیلے ہیں۔"

عالی اب بھی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

"کہاں گیا شجاعت خان؟" نشو نے دوسرا گھٹنا کھجانا شروع کیا۔

"شہر گیا ہے" عالی بولی۔ "تاریخ ہے"

"اور تو اکیلی ہے؟" نشو نے اسی پر اسرار نرمی سے پوچھا "وہ تیری چھوٹی بہن کہاں گئی۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"کیوں کیا کام ہے اس سے؟" عالی نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"اس سے تو کوئی کام نہیں بیٹی" نشو نے آگے جھک کر عالی کے گھٹنے پر سے ایک تنکا اٹھا کر باہر پھینک دیا اور پھر دیوار سے لگ بیٹھی۔ "تجھ سے ایک کام تھا"

"کیا کام ہے؟" عالی کے لہجے میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

"میں کوئی برا کام نہیں کرتی بیٹی" نشو بولی۔ "دلوں کے سودے چکانا بھی کوئی گناہ ہے" عالی یوں سمٹ گئی کہ بالکل ذرا سی ہو کر رہ گئی۔ اس کے خشک ہونٹ ٹھوڑی سمیت کپکپا گئے۔ وہ اونچی اونچی سانسیں لینے لگی اور اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ تب اس کی چھوٹی بہن ڈیوڑھی سے بھاگتی ہوئی آئی اور اپنی جھولی عالی کے سامنے الٹ کر واپس بھاگ گئی۔ یہ بلور کی سرخ سبز اور سفید گولیاں تھیں۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ عالی کے چہرے کی زردی، اس کے ہونٹوں کی کپکپی اور اس کی بھنچی ہوئی مٹھیوں کی کیفیت نشو کے جسم میں منتقل ہو گئی۔ نشو نے پاؤں سمیٹ لیے اور کواڑ سے یوں چمٹ سی گئی جیسے کواڑ کو توڑ کر دیوار میں گھس جانا چاہتی ہے۔ وہ بلور کی گولیوں کو گھورتی رہی۔ پھر اس نے عالی کی طرف دیکھا اور اس پر پاگلوں کی طرح ٹکٹکی باندھ دی۔ اس حالت میں اس کا سارا جسم اینٹھنے لگا اور پھر وہ یوں ٹوٹ کر رو دی کہ اس کے آنسوؤں سے چنوں کو بچانے کے لیے عالی نے چنگیر کو اپنی طرف کھسکا لیا۔ چنگیر کے کھسکنے سے بلور کی چند گولیاں پرلی دیوار کے ساتھ چکی تک لڑھکتی چلی گئیں اور نشو کی آنکھوں نے ان کا تعاقب کیا۔

اب نشو نے جیسے حلق میں گھٹتے ہوئے خشک چیتھڑوں کے کسی سوراخ میں سے ایک آواز نکالی "بیٹی"

عالی اس کے قریب آ گئی۔ "کہو کیا بات ہے؟"

نشو نے ایک لمحے کے لیے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آنسو پونچھ کر عالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن ایک دم اس کے تیور پھر سے بدل گئے وہ بھڑک کر اٹھی۔ دروازے میں سے نکلتے ہوئے دہلیز سے ٹھوکر کھائی اور اس کی جیب میں روپلے بج اٹھے۔ سنبھل کر وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔ عالی اس کے پیچھے بھاگی۔ مگر ڈیوڑھی کا دروازہ دور تک جاتی ہوئی ایک گلی میں کھلتا تھا۔ اس لیے وہ صحن کے وسط ہی میں رک گئی اور اس نے دیکھا کہ نشو مٹھیاں بھینچے ہوئے گلی میں یوں لپکی جا رہی ہے کہ بس نہیں چل رہا ورنہ اُڑ جاتی۔

اور خفتاں کی اذان کے بعد نئے آوے کے پاس پرانے آوے کے کھنڈر میں جب نوجوان نے قدموں کی چاپ سنی تو صاف ستھرے آسمان پر چمکتے ہوئے بے شمار ستاروں کے نرم نرم اجالے میں اس نے دیکھا کہ کوئی اس کی طرف آ رہا ہے پھر جب یہ سایہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ بوڑھی نشو ہے اور چند سکے اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہہ رہی ہے۔

"گن لو بیٹا۔ چار روپلے پندرہ آنے ہیں۔ اکنی کی میں نے نسوار خرید لی تھی۔ اللہ دے گا تو دے جاؤں گی۔ اس سے پہلے مر جاؤں تو بخش دینا اور بیٹا میں تمہارا کام نہیں کر سکی۔ وہاں شجاعت خان کے گھر میں تو عالی کی جگہ نشو بیٹھی چنے پھٹک رہی تھی اور تم مجھ سے عشق کر کے کیا لو گے؟"

ہیرا

"اور پھر شاہزادی نے تنگ آکر ہیرا چاٹ لیا۔"
چھپر تلے کچھ دیر تک خاموشی رہی۔
زینو بچّے کو گود میں لئے دودھ پلا رہی تھی۔ اس نے اوڑھنی کے نیچے ہی بچے کو دائیں سے بائیں گھمایا اور بولی "رُک کیوں گئے؟ پھر کیا ہوا؟"
دریام زور سے ہنسا "مزا آگیا کہانی سنانے کا" وہ قہقہوں کے درمیان بولا۔
——— "زینب بی بی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کیا کہہ گیا۔"
زینو جھینپ گئی "میں پوچھتی ہُوں ہیرا چاٹ لینے کے بعد کیا ہوا شاہزادی کو؟"
دریام دگنی شدت سے ہنسا۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر آہستہ سے بولا۔ "ہولے ہولے پگلی۔ کسی پڑوسن نے سُن لیا تو بھد ہوگی۔ سب کہیں گے دریام کی بیوی کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔"
زینو کی جھینپ بوکھلاہٹ میں بدل گئی "پیچ نکالنے کی تو عادت ہے تمہاری۔"
پھر یہ بوکھلاہٹ غصّہ بنی اور یہ غصّہ بچے پر اترا۔ زینو نے بچّے کو اوڑھنی کے نیچے سے کھینچ کر زمین پر لٹا دیا اور بولی "چمٹ کر رہ جاتا ہے کمبخت۔ جیسے لہو تک نچوڑ لے گا۔"
بچّہ رونے لگا۔ دریام نے پلنگ پر سے پھاند کر بچے کو اٹھایا۔ اور اسے کندھے سے لگا کر ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے زینو کو سمجھانے لگا۔ "یوں نوچ کے نہیں پھینک دیتے۔ اس طرح بچے کی آنکھوں میں پیاس آجاتی ہے۔"

مرد کو اپنی مملکت میں داخل ہوتا دیکھ کر عورت چلا اُٹھی ''بس بس رہنے دو۔ بچے کو دودھ پلانا مرد کے ذمے ہوتا تو جب میں دیکھتی کیسے چمٹاتے پھرتے دن بھر ـــــ ادھر لاؤ۔''

زینو نے بچہ چھین لیا۔ ماں کی باہوں میں آتے ہی وہ خاموش ہوگیا اور وریام پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولا ''بڑا سخت زمانہ آنے والا ہے زینو۔ یہ بچے کل بڑے ہوں گے تو ایسے ایسے کام لئے جائیں گے ان سے کہ ہم تم سوچیں بھی تو دماغ پھٹ جائیں۔ اسے خوب دودھ پلاؤ۔ خوب تندرست رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ توپ کا گولا ایک فرلانگ پر پھٹے اور وریام خاں کے صاحبزادے دھماکے ہی کے زور سے تنکے کی طرح اُڑ کر دُور جا گریں۔ میں نے ایسے سپاہی بھی دیکھے ہیں کہ اِدھر دھماکا ہوا اُدھر ہوا کا ایک جھکڑ چلا اور سپاہی نے ایسی پٹخنی کھائی کہ جنگ کے میدان میں بھی ہنسی آ گئی۔ ایسے جوانوں کو تو کوئی اخبار وخبار چھاپنے چھوپنے پر لگا دینا چاہیئے۔''

''اور تم؟'' زینو نے پیار بھرے جذبۂ انتقام سے پوچھا۔ ''تمہیں گولے کا دھماکا کتنی دور جا پھینکتا ہے؟''

''میں؟'' وریام پلنگ پر سیدھا بیٹھ گیا ''گولے سے اڑ جاؤں تو دوسری بات ہے پر جس روز دھماکے سے اڑا تو اس بیٹے کی قسم ہے۔ اپنے پیٹ میں سنگین بھونک لوں گا۔''

''بکو نہیں۔'' زینو بگڑ گئی۔

''خدا کی قسم ہے زینو۔ ایسا ہو تو ہیرا چاٹ لوں۔''

''کیا؟''

''ہیرا چاٹ لوں۔''

''ارے ہاں۔'' زینو کو کہانی یاد آ گئی۔ ''شاہزادی نے ہیرا چاٹ لیا تو پھر کیا ہوا؟''

وریام فوراً بولا ''وہ مر گئی۔''

''کیا؟''

"شاہزادی مر گئی۔ ہیرا چاٹنے سے مر جاتے ہیں نا۔"

"ہیرا چاٹنے سے مر جاتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"ارے!"

مارے جھینپ کے اب کے زینو کافی دیر تک خاموش رہی۔ پھر سوئے ہوئے بچے کو آہستہ سے پلنگ پر لٹا کر وہ دریام کے پاس بیٹھ گئی اور ذرا سا ہنس کر بولی۔ "تو تم اسی لئے ہنس رہے تھے؟"

دریام بھی ذرا سا ہنس دیا۔

"کتنے میں آتا ہے ہیرا؟" زینو نے دریام کے بازو سے لگ کر پوچھا

اور دریام نے بڑی روا روی میں کہا۔ "یہی کوئی ——— بس یوں سمجھ لو کہ ——— اگر میں بھی بک جاؤں نا۔ اور تم بھی اور ننھا بہرام بھی۔ اور یہ مکان اور یہ چھپر اور ——— یعنی ہمارا سب کچھ بک جائے نا۔ جب بھی ہیرا نہیں ملے گا۔ صرف بادشاہوں، بادشاہزادوں کے پاس ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے لوگ تو گاڑیوں کے نیچے آکر مرتے ہیں یا افیم کھالی یا سنکھیا پھانک لیا۔ امیر لوگ ہیرے چاٹ کے مرتے ہیں۔ امیروں کی موت بھی شاندار ہوتی ہے کیسے مرا؟ بس ہیرا چاٹ کے مر گیا۔ اہا ہاہا۔ یہ نہیں کہ ریل گاڑی کے نیچے لیٹ گئے۔ انتڑیاں ایک پٹڑی پر ڈھیر پڑی ہیں۔ سر دوسری پٹڑی کی طرف لڑھک گیا ہے اور چمڑا انجن کے پہیوں سے لپٹا جا رہا ہے ——— تھوہ!"

"بھاڑ میں ڈالو ہیرے کو۔" زینو مارے خوف اور گھن کے پکاری۔ "کوئی اور بات کرو۔ ایسی اچھی سی کہانی سنائی اور ایسی گندی باتیں کرنے لگے ہو آخر میں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے لام میں جا کر؟"

لام میں جا کر دریام کو سچ مچ کچھ ہو گیا تھا۔ اوّل درجے کا لٹھ مار رنگون اور سنگاپور کا چکّر لگا کر اب ایسی پتے کی باتیں کرنے لگا تھا کہ چوپال پر اس کی باتیں سننے والے اس کے آس پاس سمٹ آتے اور جب محفل برخاست ہوتی تو گھروں کو جاتے ہوئے کہتے۔

"روپیہ بھی کمالایا اور علم بھی سیکھ آیا۔ پھر یونہی پھٹتے ہیں۔" زینو دریام کی تین مہینے کی چھٹی کے شروع دنوں میں سخت چکراتی ہوئی پھرتی رہی لیکن آہستہ آہستہ دونوں میں ذہنی سمجھوتہ ہوگیا اور زینو اس کی باتوں میں دور کی کوڑیاں چننے کے بجائے پڑوسنوں سے فخریہ کہتی۔ وہ تو انگریزی بھی بولتا ہے۔ لکھتا بھی ہوگا۔ میں نے پوچھا نہیں۔ پوچھوں گی۔ گورے اسے خط لکھتے ہیں۔ میمیں اسے سلام بھیجتی ہیں۔ اب کے جائے گا تو بغداد شریف کی زیارت بھی کرے گا۔ ولایت بھی جائے گا۔ بادشاہ سلامت سے ہاتھ ملائے گا۔ میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں۔"

دریام چلا گیا۔

ایک برس کے بعد دریام واپس آگیا۔

اس کی واپسی کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔

وہ اپنے گاؤں کے اسٹیشن پر اُترا مگر کچھ یوں جیسے اسے زبردستی اُتارا جا رہا ہے۔ پھر وہ پکارا "بھئی یہ میرا گاؤں کیسے ہوسکتا ہے۔" ایک دم وہ پلیٹ فارم پر سرپٹ بھاگنے لگا۔ وہ لکڑی کے جنگلے پر سے کود گیا۔ سینے کے بل گرا اور اٹھا نہیں بلکہ یونہی سینے کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے گاؤں والے اس کی طرف بڑھے مگر گاڑی کے دروازے میں کھڑے ہوئے ایک فوجی جوان نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان سے کوئی ایسی بات کی کہ وہ جہاں کھڑے تھے وہیں جم گئے۔ پھر اس نے ایک بستر اور... بکس گاڑی سے اتار کر گاؤں والوں کے حوالے کیا اور رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا چلتی گاڑی میں سوار ہوگیا۔

رینگ رینگ کر آگے بڑھتے ہوئے دریام کے ارد گرد اب بچے جمع ہونے لگے تھے۔ وہ پہلے تو بے خبری میں رینگتا گیا مگر اچانک جب اس نے اپنے سامنے بچوں کے سائے دیکھے تو وہ چیخ کر بولا "لیٹ جاؤ بے وقوفو۔"

بچے پہلے تو اس گرج سے دہل گئے مگر پل بھر بعد ایک ساتھ ہنسنے لگے اور پھر جب انہیں سامنے سے زینو بہرام کو کوٹھے پر رکھے دوڑتی ہوئی اس طرف آتی دکھائی دی تو سب بھاگ

کھڑے ہوئے۔ اس وقت دریام گاؤں کے کیکر کے سب سے بڑے شاہ کیکر کے نیچے پہنچ گیا تھا۔

دریام نے زینو اور بہرام کو دیکھا تو چیخ کر بولا "لیٹ جاؤ۔"

زینو بالکل بین کے انداز میں پکاری "تمہیں کیا ہوگیا دریام۔ یہ زخم کیا بن کر آ گئے لام سے؟"

وہ بہرام کو وہیں خاک پر بٹھا کر دھڑا دھڑ اپنا سینہ پیٹنے لگی۔ پلیٹ فارم کے جنگلے پر سے لوگ چھلانگیں لگاتے ہوئے آئے اور ان کی طرف لپکے اور دریام یونہی لیٹے لیٹے چیختا رہا "میں کہتا ہوں لیٹ جا کمینی زمانے بھر کی۔ اندھی ہے کیا؟ دیکھتی نہیں جاپانیوں کی گولیاں ہر طرف سے سن سن نکلتی جا رہی ہیں؟"

اور جب بھاگتا ہوا ہجوم ان کے قریب پہنچ رہا تھا تو وہ اٹھا اور بولا "نہیں لیٹے گی؟" پھر اس نے تڑ سے زینو کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور ایکا ایکی اس کے چہرے پر ہلدی کھنڈ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بڑا ڈراؤنا پھیلاؤ نمایاں ہونے لگا۔ اس کی کنپٹیوں کی رگیں پھول گئیں اور وہ ایک دم یوں بچوں کی طرح بلبلا کر رو دیا کہ زینو اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اس سے لپٹ گئی۔ اسے کھینچ کر بٹھا لیا اور بھرائی اور بھیگی ہوئی آواز میں بولی "ادھر تو دیکھو دریام۔ یہ بہرام ہے۔ تمہارا بیٹا۔ پہچانتے ہو اسے؟"

دریام نے اثبات میں سر ہلایا اور روتے ہوئے بہرام کو اُٹھا کر سینے سے بھینچ لیا۔

زینو بولی "اور یہ درخت کون سا ہے؟"

"شاہ کیکر ہے۔" دریام بولا "کیا بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔"

زینو اتنے بہت سے آنسوؤں میں بھی مسکرا رہی تھی بولی "اور یہ میں ہوں۔ جانتے ہو؟ یہ میں ہُوں میں۔ بھلا بتاؤ تو میں کون ہُوں؟"

"زینو ہو اور کون ہو؟" دریام کے خشک ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی مسکرانے لگے۔

"شکر ہے خُدا کا۔" ایک بولا۔

"یہ تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" دوسرے نے رائے ظاہر کی۔

"جو لام سے جیتا جاگتا لے آیا ہے وہ یہاں بھی فضل کرے گا" ایک بوڑھے نے کہا۔ دریام نے اُوپر دیکھا۔ پھر جیسے اچانک کچھ یاد آتے ہی اس نے بہرام کو گود سے اُتارا اور اٹھ کر سب سے بڑے تپاک سے ملا۔ انہیں ان کے ناموں سے پکارا۔ اسے تو اُن کے بچّوں تک کے نام یاد تھے۔ اسے تو یہ بھی یاد تھا کہ ننھے خاں میراثی کی بیوی کسی کے ساتھ کہیں بھاگ گئی تھی۔ مگر ہر سال کسی نہ کسی کے ہاتھ ننھے خاں کو پیار بھجواتی تھی۔ "اب بھی پیار آتے ہیں؟" اس نے ننھے سے پوچھا اور ننھا بولا۔ "اب تو دریام خاں، ہر سال پیار کے ساتھ ایک بچّے کی خبر بھی آجاتی ہے۔ اور اس سال تو اکٹھے دو ہوتے تھے اور وہ بھی مذکر" سب لوگ بے اختیار ہنسنے لگے۔ پھر دریام نے بہرام کو اٹھایا اور سامنے اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ زینو نوچے ہوئے بالوں اور کوٹے ہوئے سینے کو چادر سے ڈھانکتی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ پھر دو آدمیوں نے واپس جاکر پلیٹ فارم پر سے دریام کا بکس اور بستر اٹھایا اور جب وہ دریام کے گھر پہنچے تو وہ چھپر تلے پلنگ پر بیٹھا شیشے کے گلاس میں لسّی پی رہا تھا اور بہرام نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال ڈال کر اسے اُدھیڑ ڈالا تھا۔

دریام نے لسّی پی اور بچّے کو پیٹ پر بٹھا کر لیٹ گیا۔ فوراً ہی وہ سو گیا اور زینو نے بہرام کو آہستہ سے اس کے پیٹ سے اتار لیا۔ وہ دن بھر دروازے پر بیٹھی گاؤں والیوں سے دریام کی عجیب و غریب بیماری کی باتیں کرتی رہی۔ چند لوگوں نے آکر اسے بتایا کہ کوئی خاص فکر کی بات نہیں جس فوجی نے دریام کا بکس اور بستر ان کے حوالے کیا تھا وہ کہتا تھا کہ دریام پاگل تو بالکل نہیں۔ ذرا سا بیمار ہے۔ "اس سے کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے اُسے غصّہ آجائے۔ غصّہ آجائے تو اسے کچھ ہو جاتا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک ہے۔ اکتالیس دن تک سائیں سبز شاہ کے مزار کی خاکِ پاک چاٹی تو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ وہ کبھی بیمار بھی تھا۔ فکر کی ضرورت نہیں۔"

دریام دیر تک سوتا رہا۔ شام کی گاڑی آئی تو دُور سے اس نے سیٹی بجانی شروع کی اور پلیٹ فارم تک یہ سیٹی نہ ٹوٹی۔ اس وقت گاؤں کے ریوڑ چراگاہوں کو واپس آتے ہوئے ریلوے لائن عبور کرتے تھے۔ اس لئے ریل کے انجن کو ہر روز اسی طرح چیخنا پڑتا تھا۔ گاڑی کی تیز سیٹی سے بھی دریام کی آنکھ نہ کھلی۔ پھر جب گاڑی چلی گئی تو دریام کی آپ ہی آپ آنکھ

کھل گئی۔ اس وقت بہرام کہیں اندر اس کے بکس کے تالے سے کھیل رہا تھا۔ دریام اٹھا۔ زینو کو پکارا تو آواز آئی "یہاں تمہارے پاس ہی تو بیٹھی ہوں دریام۔"

دریام نے پلٹ کر دیکھا تو زینو اسی کے پلنگ کے پائے پر بیٹھی تھی۔

"کب سے بیٹھی ہو؟"

"دیر سے۔"

"کیا کر رہی ہو؟"

"تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

دریام نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے زینو کو اس زور سے بھینچا کہ وہ "ہائے میری سانس۔ ہائے میری پسلیاں" پکارتی رہی اور ٹانگیں پھڑپھڑاتی رہی مگر دریام نے کافی دیر تک اسے اپنی گرفت سے آزاد نہ کیا۔ پھر جب اس نے زینو کو چھوڑا تو وہ الگ ہٹ کر بولی "دروازہ کھلا تھا دریام۔ کوئی آجاتا تو کیا ہوتا؟"

"آجاتا تو چلا جاتا۔" دریام نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اور بولا "ابھی تک چراغ نہیں جلایا؟"

"نہیں تو —— جلا دوں؟"

"نہیں مجھے تم سے ایک دو باتیں کرنی ہیں اندھیرے میں۔"

"کرو۔"

"میرے پاس آجاؤ۔" اس کی آواز اچانک بھرّا گئی۔

زینو اس کے پاس آگئی۔

"زینو" وہ بڑی ہی گھٹی ہوئی آواز میں بولا "دیکھو" اس نے لجاجت سے کہا اور زینو اس پر جھک گئی۔ اور اس کے بال اس کے شانوں پر سے گر کر دریام کے چہرے کو چھونے لگے۔

"سنو زینو" دریام رکتے ہوئے بولا۔

زینو لپک کر گئی۔ دروازے کی زنجیر چڑھا کر بھاگتی ہوئی واپس آئی اور دریام کے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھ کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اس پر سے نگاہوں کی آرتی اتار رہی ہے۔

"سنو زینو" دریام بولا "جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرا ایک دوست تھا زینو۔ میرے ساتھ والے مورچے میں تھا۔ گولے برس رہے تھے۔ گولے برستے رہے۔ جب ذرا سی خاموشی ہوئی تو میں نے کہا "نواز اگر کوئی گولا اِدھر اُدھر گرنے کے بجائے یہاں میرے تمہارے مورچے میں آگرے تو ہمارے لدھڑے ہوئے جسم جانے کس جانور کی خوراک بنیں گے۔ میں نے یہاں خاموش راتوں میں گیدڑوں کو بھی روتے سنا ہے۔ تو کیا ہم مسلمان جوانوں کے جنازوں کو گیدڑ کھائیں گے؟ ہو سکتا ہے ہماری لاشوں پر سے ٹینک گزر جائیں اور ہمارا چمڑا ان کے پہیوں سے لپٹ جائے اور سپاہی ہیلچوں سے ہمارے چمڑے اور چربی کو ٹینک سے جدا کریں۔ ممکن ہے کہیں سے گدھیں ــــــ"

زینو جو دریام کو خفا کر بیٹھنے کے ڈر سے اب تک ضبط کئے بیٹھی تھی۔ چیخ اُٹھی اور دریام کے منہ پر ہاتھ اور اس کی چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگی۔

دریام نے بڑے پیار سے اس کا چہرہ اٹھا کر آئینے کی طرح اپنے سامنے رکھ لیا اور بولا۔ "سنو نو۔ پھر کیا ہوا کہ گولوں کی ایک اور باڑ چلی۔ ہمارے گولے بھی ہمارے مورچے پر سے ہواؤں کو پھاڑتے ہوئے نکلے جا رہے تھے۔ ایک بار پھر دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ تو میں نے نواز کو پکارا۔ جواب نہ ملا تو مجھے فکر ہوئی کیونکہ وہ تو گولوں کے طوفان میں بھی کان پر ہاتھ رکھ کر علی حیدر کے دوہے گاتا رہتا تھا۔ میں اپنے مورچے سے نکلا اور سینے کے بل لیٹ کر رینگتا ہوا اس کے مورچے پر پہنچا۔ تو زینو۔ مجھے بہرام کی قسم ہے۔" دریام رُک گیا اور بولا "ادی وہ اکیلا اندر بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی رُت ہے۔"

"وہ تمہارے بکس کے اُوپر بیٹھا ہے۔" زینو جلدی سے بولی۔

دریام نے فوراً کہانی کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا۔ "دبھی زینو مجھے اس بہرام کی قسم ہے کہ وہاں مورچے میں سر کے سوا اس کے سارے جسم کو جیسے کسی نے بوٹیوں بوٹیوں کاٹ کر ڈھیر لگا دیا تھا۔ پھٹا ہوا چمڑا دھجی دھجی بنا کر بکھرا پڑا تھا۔ اور ایک طرف اس کا سر پڑا تھا۔ چاند کی طرح پیلا اور بڑا ہی معصوم سا۔ جانے موت کے بعد نواز کا چہرہ بچے کے چہرے کی طرح چھوٹا سا اور بھولا بھالا سا کیوں ہو گیا تھا تب زینو مجھے ایسا لگا کہ نواز نہیں مرا بہرام مر گیا ہے۔

اور یہ سپاہی نہیں مرا۔ ایک بچے کو کسی قصائی نے کاٹ ڈالا ہے۔ پھر مجھے ایک دم ایسا لگا کہ یہ نواز نہیں ہے۔ یہ تو میں ہوں۔ اور میں مر گیا ہوں اور میرے اندر کسی چیز نے میری بوٹی بوٹی کاٹنی شروع کر دی ہے۔ بھئی مجھے بہرام کی قسم ہے زینو۔ مجھے تمہاری قسم ہے، خدا کی قسم ہے کہ اس وقت مجھے اپنے گوشت میں سے گزرتی ہوئی چھری کی چر چر کی آواز بھی سنائی دے گئی۔ بس اس کے بعد مجھے ہسپتال لے گئے اور جب سے سنا ہے کہ میں بکتا جھکتا رہتا ہوں اور بھاگ کھڑا ہوتا ہوں اور بھاگتے بھاگتے زمین پر دھب سے لیٹ جاتا ہوں۔ جانے کیا کیا بتاتے ہیں لوگ۔ پر زینو میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ مجھے تو نیند آجاتی ہے، مجھے تو یہ تک یاد نہیں کہ گاڑی سے اتار کر مجھے وہاں شاہ کیکر کے نیچے کون بٹھا گیا تھا جہاں سارا گاؤں میرے گرد جمع تھا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے زینو۔ میں نے تو ایسی لاشیں بھی دیکھی ہیں جو اکڑتی ہیں تو اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پھولتی ہیں تو ذرا سا چھُونے سے بھی بھیڑوں کی طرح باں سے بول اٹھتی ہیں۔ پر اس نواز نے تو ——— بھئی زینو، اب ذرا بہرام کو بلا دو نا۔"

زینو جیسے کہیں دُور سے بولی۔" بلاتی ہوں پر وعدہ کرو۔ اس سے ایسی ڈراؤنی باتیں نہیں کرو گے۔"

دریام گرجا۔" تو کیا تم نے سچ مچ مجھے باؤلا سمجھ لیا ہے؟ تو کیا میں پاگل ہوں اچھا تو میں پاگل ہوں۔ کر لو جو کرنا ہے۔ میں پاگل ہوں۔ بلاؤ اسے۔ وہ کہاں ہے اس سے کہو جہاں بھی ہے لیٹ جائے۔ دیکھتی نہیں جاپانیوں کی گولیاں ہر طرف سے سن سن کرتی نکلی جا رہی ہیں۔"

وہ پلنگ سے کُود کر زمین پر سینے کے بل لیٹ گیا اور رینگتا ہوا مکان کے اندر جانے لگا۔ زینو پہلے تو بہرام کو بکس پر سے اٹھا لینے کے لئے بھاگی مگر پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ بچے کو اُٹھا کر چیختے ہوئے دریام کے پاس آئی اور دم بخود بہرام کو اس کے پاس لٹا دیا۔ پھر خود بھی وہیں لیٹ گئی۔"یوں" دریام بولا۔" اب ٹھیک ہے۔ اب ہم محفوظ ہیں۔ گولا سیدھا ہمارے اُوپر آکر پھٹے تو دوسری بات ہے۔"

زینو کچھ دیر تک لیٹی رہی۔ پھر ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر دیکھا تو بہرام باپ کے بالوں سے کھیل رہا تھا اور دریام گہری نیند سو رہا تھا۔ اور زینو باہر دیوار پر ٹھوڑی رکھ کر کھڑی ہوئی پڑوسنوں

کو دریام کے شور کا سبب بتانے آنگن میں چلی گئی۔

یہ سلسلہ مہینوں تک جاری رہا۔ دریام پر محض اس بات سے بھی پاگل پن سوار ہو جاتا تھا کہ پانی کے گلاس میں تنکا تیر رہا ہے، یا ترکاری میں نمک کم ہے۔ پھر ایک دم اس کے ذہن میں جاپانی گولیاں چلانے لگتے۔ اور وہ گھر میں میدان جنگ قائم کر دیتا۔ تھک ہار کر سو جاتا اور جب اٹھتا اور زینو سے ضد کر کر کے سارا حال معلوم کرتا تو اس کے زانو پر سر رکھ کر کئی بار وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا اور بہرام کو سینے سے لگائے دیر تک آنگن میں ٹہلتا رہا۔

زینو بیس بیس کوس پیدل جا کر بڑے بڑے پیروں سے تعویذ لے کر آتی۔ اس نے سائیں سبز شاہ کے مزار پر سوجی کے حلوے کی کڑاہی چڑھائی اور روزانہ چٹکی چٹکی بھر خاکِ پاک لا کر دریام کو چٹاتی رہی۔ سنیاسیوں سے ٹوٹکے لئے اور تنکے سوئی پر چڑھا کر دواؤں کی غیر محسوس مقدار یں مکھن میں لپیٹ کر دریام کو کھلائیں۔ اس نے پانچوں نمازیں ادا کرنا شروع کر دیں۔ اور ہر نماز کے بعد جب وہ دُعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی تو خوب خُوب روتی۔

پہلے پہل دریام نے اسے رونے سے روکا مگر پھر اس کا عادی ہو گیا۔ کہتا۔ "چلو رو لو زینو۔ یہ بھی کر دیکھو۔"

ایک دن جب اس نے دیکھا کہ بہرام زینو کے پاس بیٹھا مٹی کھا رہا ہے اور زینو اپنے ہی کسی خیال میں کھوئی ہوئی اس کی طرف تکے جا رہی ہے مگر اسے روکتی نہیں تو اس پر بلا کا پاگل پن سوار ہو گیا۔ اس نے گلاس اُٹھا کر زینو کے سَر پر دے مارا اور جب اس کے سَر سے خون پھوٹ نکلا اور بہرام مٹی بھرا منہ کھول کر بلبلانے لگا تو دریام دھب سے زمین پر لیٹ گیا اور چلایا "دریام لیٹ جاؤ کم بختو۔ رونے رلانے سے کچھ نہیں بنے گا۔ آنسو گولیاں نہیں روک سکتے۔ بیوقوفو اری زینو۔ تو نے سَر میں گولی کھائی ہے۔ تو کیا اب پیٹ بھی چھلنی کرائے گی۔ لیٹ جا کمینی۔"

تھک ہار کر جب وہ زمین پر ہی سو گیا اور زینو نے آس پاس چار پائیاں کھڑی کر کے اس کے سر کے نیچے تکیہ لا کر رکھ دیا تو ایک پڑوسن نے دیوار پر سے جھانک کر کہا۔ "زینو بہن۔ اس سے تو دریام کہیں وہیں لام میں مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔"

زینو آپے سے باہر ہو کر گالیوں کا طومار باندھتی ہوئی اُٹھی اور پڑوسن کے ماتھے پر تڑاق سے

وہی گلاس دے مارا جس نے اس کے سر کو زخمی کیا تھا۔ پڑوسن گلاس سمیت دوسری طرف گری اور پھر محلّے بھر میں کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے زخمی عورت کے عزیزوں کو بمشکل زینو سے بدلہ لینے سے روکا۔ اور جب روتی ہوئی زینو نے بھی پڑوسن میں جاکر معافی مانگ لی اور اپنا گلاس اٹھاکر جانے لگی تو زخمی پڑوسن بھی رو دی اور بولی "ہمارے بھرے پُرے پڑوس کو اجڑا سمجھو۔ یہ زینو بھی ادھر ہی جارہی ہے جدھر دریام جاچکا ہے۔ بے چارے بدنصیب۔"

شام کی گاڑی بھی لمبی سیٹی بجاتی ہوئی آئی اور گزر گئی۔ مگر بہرام کی آنکھ نہ کھلی۔ زینو شام تک تو اس کے پاس بیٹھی آتی جاتی چیونٹیوں کے رُخ بدلتی رہی تاکہ وہ وریام کو پریشان نہ کریں مگر جھٹپٹے کے بعد اس نے دریام کو آج پہلی بار جگانے کی کوشش کی "یہ کیا ہے؟" وہ بولا۔ زینو نے کہا "اندر آجاؤ۔ ٹھنڈ پڑنے لگی ہے۔" اور دریام "چلو" کہہ کر اٹھا اندر آکر ایک چارپائی پر گرا اور یوں سوگیا جیسے جاگا ہی نہیں تھا۔

آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلی تو بچہ سو رہا تھا اور زینو چراغ کی میلی زرد روشنی میں بیٹھی دریام کا سر دبا رہی تھی۔ وہ اٹھا۔ زینو کو بہت سے پیار کئے اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی کو چھوا تو بولا "یہ کیا ہے؟" اور جب زینو نے اسے دن کا واقعہ سنایا تو وہ اس کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگا اور بولا "سچ مچ اگر میں مر ہی جاؤں تو کچھ زیادہ نہیں بگڑے گا۔"

زینو اچانک جیسے پتھر کر رہ گئی مگر پھر جیسے اپنے آپ سے لڑ کر مسکرا دی اور بولی "مر تو جاؤ پر کہیں سے ہیرا بھی تو ملے۔ تمھی نے تو کہا تھا کہ سان سے مرنا ہے تو ہیرا چاٹ کے مرو۔"

دریام بچوں کی طرح بہل گیا۔ بولا "سچ مچ زینو۔ کہیں سے مجھے ہیرا لادو۔ چلو طے پایا کہ جب تک تم کہیں سے ہیرا نہیں لاتیں میں مروں گا نہیں۔ سُنا ہے جاگیردار کی نئی بیوی کی ہر انگلی میں ایک ایک ہیرا ہے۔ کبھی جانا اس کے پاس۔ کہنا۔ ایک انگوٹھی دے دو۔ ابھی واپس کردوں گی۔ بس دریام کو اسے ذرا سا چاٹنا ہے۔"

دونو بے اختیار ہنسنے لگے۔ دریام تو اس کے بعد سو گیا۔ لیکن زینو جاگتی رہی۔ وہ ویسے بھی راتوں کو جاگتی رہتی تھی۔ اس کا سارا اثاثہ ختم ہوچکا تھا اور وہ جاگیردار اور دوسرے بڑے گھروں کی چکی پیس کر پانی بھر کر اور کپڑے دھو کر گھر بھر کا پیٹ پال رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر

گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کے بال ہر وقت اُجڑے رہتے تھے اور وہ سوتے میں کراہتی تھی۔ وہ بہرام کو ساتھ لے کر باہر چلی جاتی اور محنت مزدوری کر کے واپس آجاتی۔ اسے یقین تھا کہ وریام گھر سے نہیں نکلے گا کیونکہ جب وہ بیمار ہوتا تھا تو چارپائی سے گر کر زمین سے چمٹ جاتا تھا اور ہوش میں تو وہ بچوں تک سے نظریں ملانے سے کتراتا تھا اور اسی لئے گھر میں دبکا پڑا رہتا تھا۔

ایک دن زینو واپس گھر میں آئی تو اس کے سر پر ایک بڑا سا چمکتا ہوا برتن تھا اور بہرام نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک پوٹلی سی اٹھا رکھی تھی۔ وریام نے پلٹ کر دیکھا اور بولا "آ گئیں زینو؟"

"ہاں" وہ بولی "کیا کرتے رہے؟"

"گنگناتا رہا" وریام بولا "آج تو مجھے بڑے پرانے پرانے گیت یاد آتے رہے۔ وہ گیت بھی جو تم نے بیری پر چڑھی ہوئی سہیلیوں کے ساتھ مل کر گایا تھا اور جب میں نیچے سے گزرا تھا تو سہیلیوں نے تم سے کہا تھا۔ چپ کر ری نیچے تیرا ہوتا سوتا جا رہا ہے۔ یاد ہے؟ ان دنوں ہماری تازہ تازہ منگنی ہوئی تھی اور میں کتنی بار جان بوجھ کر تمہارے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ یاد ہے نا؟"

"یاد ہے" زینو بولی "یہی یادیں تو جینے کی مٹھاس ہیں۔"

وریام کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے بہرام کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور اسے کوئی کہانی سنانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد زینو کھانا لے کر آئی اور وریام کے سامنے چن دیا۔ وریام سب سے پہلے پلاؤ کھانے لگا۔ بہرام نے حلوے کی رکابی پر ہلّہ بول دیا۔ زینو نیچے بیٹھی مکھیاں جھلتی رہی اور دونوں کو باری باری بڑے پیار سے دیکھتی رہی۔ ایک بار اس نے بچے کو ڈانٹا۔ "ارے آرام سے کھا لڑکے۔ آدھا کھاتا ہے آدھا گراتا ہے۔ ایسا حلوہ روز روز تھوڑی ملے گا"

"حلوہ بھی ہے؟" وریام نے حیران ہو کر پوچھا۔ پھر وہ مسکرا کر بولا "آج تو زینو نے گھر کو آگ لگا دی ہے۔ یہ پلاؤ تو بڑا ہی مزیدار ہے۔ کتنا اچھا پکایا ہے تم نے۔"

"میں نے تو نہیں پکایا" زینو بولی۔

"تو پھر کس نے پکایا ہے؟" دریام نے ایک اور نوالہ بناتے ہوئے پوچھا
"جانے کس نے پکایا ہے" وہ بولی "میں تو جاگیردار کے گھر سے لائی ہوں"
"کیوں؟" دریام نے نوالہ رکابی ہی میں رکھ دیا۔
"آج اس کے بیٹے کا چالیسواں تھا"
"چالیسواں چھوڑ پچاسواں ہو پر وہ لوگ ہمارے کیا لگتے ہیں؟"
"کچھ نہیں"
"تجھے کیوں دیا یہ پلاؤ اور یہ حلوہ؟"
"بس دے دیا دریام۔ غصے نہ ہو" زینو نے التجا کی۔
"میں پوچھتا ہوں کیوں دیا؟" دریام نے پلنگ پر سے ٹانگیں لٹکالیں اور بہرام نے رونے کی تیاری میں نچلا ہونٹ لٹکا لیا "کیوں دیا؟" دریام گرجا۔
"بس غریب جان کے دے دیا" زینو نے آہستہ سے کہا۔
"مطلب یہ کہ جاگیردار نے خیرات دی؟"
"ہاں"
"اور تم نے لے لی؟"
زینو خاموش رہی۔
"اپنے بیٹے کی آنکھوں میں پیاس دیکھ رہی ہو؟"
زینو پھر بھی خاموش رہی۔
"مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ہم آج کل بھیک کھا رہے ہیں"
زینو اب تک اس لئے خاموش تھی کہ اسے دریام پر پاگل پن سوار ہونے کا یقین ہو گیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس میں ایسے کوئی آثار پیدا نہیں ہو رہے تو وہ ٹوٹ کر رو دی اور بولی "دریام پیارے۔ میرے پاس دستِ غیب تو نہیں ہے کہ ہر صبح کی نماز کے بعد مصلے کے نیچے سے پانچ روپے نکال لوں آج ایک سال سے تمہاری پنشن کا بھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اور دریام میں نے تو وہ مراد آبادی برتن تک بیچ ڈالے ہیں جو تم نے بریلی سے خریدے تھے۔ ان

میں سے ایک یہی گلاس باقی رہ گیا ہے جس میں ہم پانی بھی پیتے ہیں اور ایک دوسرے کے سر بھی پھوڑتے ہیں۔ تو پھر بتاؤ دریام۔ میں اور کیا کروں؟ تمہیں پتہ نہیں پر میں نے چکی پیسی ہے۔ میں نے پانی بھرا ہے۔ میں نے کپڑے دھوئے ہیں۔ تم نے مجھ سے یہ بھی کبھی نہیں پوچھا۔ کہ باہر جا کر اتنی دیر کیا کرتی رہتی ہو۔ تم نے مجھ سے یہ بھی کبھی نہیں کہا کہ اجڑے بالوں میں کنگھی کر لو۔ میں نے محنت مزدوری کے بعد بدلے میں چٹکی بھر آٹا پایا ہے۔ تو گھر آئی ہوں اور توے پر تمہارے اور بہرام کے لئے ایک روٹی ڈالی ہے اور خود بھوکی رہی ہوں۔ وہ تمہاری لائی ہوئی رنگون کی قمیص دس روپے میں بیچ کر میں نے سائیں سبز شاہ کے روضے پر کڑاہی چڑھائی تھی۔ اب کے عید میں جو تم نے نئی پگڑی باندھی ہے تو یہ میرے آخری کنگن کی قیمت تھی۔ بھلا بتاؤ تو میں نے جو یہ چادر اوڑھی ہے تو یہ کہاں سے آئی ہے؟ دریام کے جو کُرتے بنے ہیں تو وہ کہاں سے ملے؟ یہ سب گاؤں کے خدا ترسوں کی مہربانی ہے ورنہ دریام آج میں اور تم اور بہرام سب ننگے نظر آتے اور ہم یہیں اس چھپر تلے مارے بھوک کے سوکھ کر مر جاتے۔"

"مر جاتے تو اچھا تھا۔" دریام بولا۔

پھر وہ اٹھا اور آنگن میں ٹہلنے لگا۔ "جیتے تو کون سا تیر مار لیا۔ مر جاتے تو کیا بگڑ جاتا۔ تین نئے پتے شاخ پر پیدا ہوتے ہیں تو شاخ کے زیور نہیں سج جاتے۔ اور جب یہ تین پتے ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں تو درخت لٹ نہیں جاتا۔ سمجھیں زینو؟ اور ہم نے تو خیر جو گزارنی تھی گزار لی۔ پر بہرام کو کبھی غور سے دیکھا ہے؟ اور جانتی ہو یہ نئے زمانے کا بچہ ہے۔ اسے تو بڑا ہو کر بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ ہم نے تو نوازکی بوٹیوں کا ڈھیر دیکھا تو پاگل ہو گئے۔ پر اس نئے زمانے کے تاج الملوک کو تو بگلی، خون پسینے کے کتنے سمندر کاٹ کر خوشیوں کی بکاؤلی کا پھول لانا ہے جانتی ہو نیا زمانہ کتنا سخت ہے؟"

"میں کیا جانوں۔ میرے لئے تو ہر زمانہ نیا زمانہ ہے۔" زینو ناگواری سے بولی۔

دریام نے زینو کے لہجے کی تھکن محسوس کر لی۔ بولا۔ "بکاؤلی کی کہانی یاد ہے؟ نہیں؟ سناؤں؟ آؤ ادھر چارپائی پر آ جاؤ۔ ڈرو نہیں۔ آج میں بالکل ٹھیک ہوں آخر تر ترا تا پلاؤ کھایا ہے۔"

وہ دیر تک زینو کو بکاؤلی کی کہانی سناتا رہا۔ بہرام زینو کی گود میں سو گیا تھا اور ساتے ڈھل

کر ملبے ہو رہے تھے۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو زینو بہرام کو ایک طرف لٹا کر اور دریام کے ماتھے پر ہلکا سا پیار کر کے مکان کے اندر دہلیز کے پاس برتن دھونے بیٹھ گئی۔ اور جب وہ برتن دھو چکی تو بولی۔ "دریام۔ وعدہ کرتی ہوں۔ اب خیرات نہیں لوں گی۔ خیرات لوں تو ہیرا چاٹوں۔"

زینو نے مسکرا کر چھپر کی طرف دیکھا مگر دریام وہاں موجود نہ تھا۔ پھر اس نے دریام کو نہ جانے کیوں اس زور سے پکارا کہ بہرام چیخ کر جاگ اٹھا۔ بہرام کو کولھے پر بٹھا کر وہ باہر بھاگ گئی۔

دریام اپنے گھر اور اسٹیشن کے درمیان شاہ کیکر کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ زینو لپک کر اس کے پاس گئی تو وہ بولا "کیوں زینو۔ کیا بات ہے؟ تم تو بالکل چٹی دھجی ہو رہی ہو۔"

زینو بولی۔ "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

دریام نے مسکرا کر کہا "کچھ نہیں بس ذرا ریل گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے تو اس کے آگے لیٹ جاؤں۔"

زینو دریام کی شگفتگی کے باوجود سناٹے میں آ گئی۔ پھر اس نے دریام کا بازو پکڑ کر اسے گھر کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ "ایسی باتیں نہ بکا کرو۔"

"تم ہیرا لا کے تو دیتی ہی نہیں۔" دریام اسی لہجے میں بولا اور زینو کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور پھر اس نے بہرام کو اس کے بازوؤں سے لے کر اپنے کندھے پر بٹھا لیا اور جب گھر میں داخل ہوا تو بہرام کو اتار کر بولا "آج سے میں کام کروں گا زینو۔ چاہے مجھے سائیسی ہی کیوں نہ کرنی پڑے پر زینو اور بہرام کو حلال کی کمائی کھلاؤں گا۔ میں تمہیں یوں گلیوں میں ———"

اچانک دروازہ کھلا اور ایک میراثن اندر آئی۔ بولی "ملکانی کہہ رہی ہیں بہت سے گوشت بھی بچ گیا ہے۔ آ کے لے جاؤ۔"

دریام تڑپ کر بولا "ملکانی سے کہو کتوں کے آگے ڈال دیں۔"

میراثن تڑ سے بولی۔ "ہم بھی تو کتے ہیں دریام خاں۔ غریب آدمی بھی تو گلی کا آوارہ کتا ہی ہوتا ہے۔"

دریام جیسا بیٹھا تھا، بیٹھا رہ گیا۔

زینو نے میراثن کو اشارہ کیا اور اسے مکان کے اندر لے گئی۔ اس سے دیر تک کچھ باتیں کرتی رہی۔ پھر دونوں وہیں بیٹھ کر جاگیر دار کے دھلے ہوئے برتنوں کو کپڑے سے رگڑ رگڑ چمکانے لگیں اور بچہ ان کے پاس بیٹھا مٹی کھاتا رہا۔

میراثن کو برتن دے کر زینو بولی۔ "چپکے سے نکل جا۔ دریام کچھ بولے بھی تو کچھ نہ کہنا۔ پہلے بھی آتے ہی تم نے اتنی بڑی بات بک دی۔ اسے کچھ ہو جاتا تو؟ جب وہ سو جائے گا تو میں ـــــ ٹھہر جائیں دیکھ تو دوں دریام کس طرف دیکھ رہا ہے۔"

اس نے باہر جھانکا اور بولی "نکل چل۔ اس وقت نہیں ہے۔"

میراثن جھپ سے باہر نکل گئی۔

بہرام کے مٹی بھرے منہ کو صاف کر کے زینو نے اسے اُٹھایا اور باہر آ گئی۔ آنگن میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک دم اس زور سے بھاگ نکلی کہ بہرام اس کے کولہے پر ہر قدم پر اچھل اچھل جاتا تھا۔ وہ شاہ کیکر کے پاس سے بھی نکل گئی۔ ادھر سے بہت لوگ آ رہے تھے۔ جب وہ ان کے پاس پہنچی تو رُکی نہیں۔ صرف اتنا پوچھ لیا "ادھر کہیں دریام تو ـــــ"

پھر وہ انہی قدموں پر رُک گئی اور لوگوں کے چہروں پر نظریں گاڑے کھڑی رہی۔ اچانک وہ بہرام کو سینے سے چمٹا کر ڈراؤنی چیخیں مارتی ہوئی بھاگی مگر وہ پلیٹ فارم پر دیر سے پہنچی تھی۔ اس وقت قلی گاڑی کے پہیّوں سے دریام کے چیتھڑے کو الگ کر کے بیلچوں کے سہارے کھڑے چپ چاپ رو رہے تھے۔ اور اسٹیشن ماسٹر مولوی عبدالرّب انجن ڈرائیور سے کہہ رہے تھے۔ "مرنے کے لئے بھی ایک سلیقہ چاہیئے، یہ نہیں کہ ـــــ"

مُخبر

لالہ تیج بھان انسپکٹر نے دفترِ آبکاری میں ملتان کے چنے ہوئے مُخبروں سے میرا تعارف کرایا اور جب وہ زرد چہروں اور میلی آنکھوں کی اس قطار کے آخر میں پہنچے تو بولے "یہ خادو ہے۔"

سب مُخبر متعارف ہونے کے بعد باہر چلے گئے تھے اور اب ہمارے سامنے صرف خادو کھڑا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خادو کو کسی نے شکنجے میں سے نچوڑ کر نکال لیا ہے اور اب جیتے جاگتے انسان کے بجائے میرے سامنے انسان کا ایک مڑا تڑا چھلکا رکھا ہے۔ وہ سر سے ننگا تھا۔ لمبے لمبے پٹے گردن تک لٹک رہے تھے۔ مانگ میں اینٹھن سی تھی۔ البتہ اس نے چوٹی پر مستطیل شکل کے ایک منڈے ہوئے حصے کی راہ سے سر کو خوب نیل پلا رکھا تھا۔ ایک کان پر سگرٹ کا ایک ٹرا اٹکا ہوا تھا۔ اور دوسرے کان کی لَو میں ایک چھلا سا لٹک رہا تھا "استاد کی نشانی ہے" اس نے بعد میں مجھے بتایا تھا ——— "استاد نے کہا تھا تو پہلا آدمی ہے جو میری طرح جھنگ کا یہ گھڑا پی کر ایک منگرا اور مانگ رہا ہے۔ ورنہ یہاں تو بڑے بڑے نشئی دو تین منگروں کے بعد ہی راجہ رسالو بن جاتے ہیں۔"

آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا مگر پتلیاں ایسی گدلی گدلی سی تھیں۔ جیسے برسوں کی دھول سمیٹ رکھی ہو۔ ناک ہلدی کی گانٹھ معلوم ہوتی تھی اور ہونٹ اس کے چہرے سے کچھ زیادہ ہی سیاہ تھے۔ گردن کی ایک ایک رگ کچھ یوں غیر معمولی طور سے اُبھری اور تنی ہوئی تھی جیسے اس کے دماغ اور دل میں رسہ کشی ہو رہی ہے۔ کرتے میں میل رچ گیا تھا اور تہ بند پر جا بجا

شوربے کے دھبے تھے۔

لالہ تیج بھان نے جب اس کا نام بتایا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس کے کالے حاشیوں والے لمبے لمبے دانت یوں ساتھ نمایاں ہو گئے جیسے کسی نے کچا تربوز چیر ڈالا ہے۔ مگر مجھے اتنے بہت سے دانتوں کے آس پاس مسوڑے کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ "چرس نے کھائے" اس نے بعد میں بتایا تھا۔ "اور مسوڑوں کا کیا ہے سائیں۔ یہی ہوگا نا کہ دانت گر جائیں گے۔ گر جائیں۔ چرس تو پوپلے منہ سے بھی پی جا سکتی ہے۔" اس کے نیچے کے دو دانتوں پر چاندی کا ایک ایک تار لپٹا ہوا تھا اور دانتوں کی ریخوں میں دنوں کا کوڑا گھسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

لالہ جی اس کا نام بتا چکے تو ایک سکھ اندر آیا۔ لالہ تیج بھان کو جھک کر سلام کیا اور مجھے ایک اچٹتی سی سرپرستانہ نظر سے دیکھ کر خادو کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

لالہ جی بولے۔ "یہ خادو ہے۔ میں اسے خادو جادو کہتا ہوں، کیونکہ یہ سارے ملتان میں پہلا نمبر مخبر ہے۔ پہلا نمبر مخبر تو یہ دلاسہ سنگھ بھی ہے۔ پر بات یہ ہے کہ مجھے اس ضلع میں آئے ڈھائی برس ہو رہے ہیں۔ ڈھائی برس میں تیس مہینے ہوتے ہیں۔ خادو نے تیس مخبریاں کی ہیں اور تیس کی تیس سچی مخبریاں۔ اور تیسوں اتنے بڑے مقدمے کہ ڈی سی نے چند مقدموں پر تو مجھے "ویل ڈن" دیا اور ایک مقدمے پر پانچسو روپے انعام کی سفارش کر دی۔ خادو نے بھی ان مخبریوں میں کوئی ہزار روپیہ تو کمایا ہوگا۔"

خادو پہلی بار بولا۔ "اللہ نگہبان ہو، جھوٹ کیوں بولوں۔ آپ کے دربار سے میں نے تو گیارہ سو چھلڑ پائے۔ بچے دعائیں دیتے ہیں۔"

لالہ تیج بھان بولے۔ "اب یہ خادو کا جادو نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی کوئی بھی مخبری غلط نہ نکلی۔ ایک آدھ بار تو کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔ اسی دلاسہ سنگھ کو لیجئے۔ شراب کی بھٹیوں کا مخبر ہے۔ آٹھ بھٹیاں پکڑوا چکا ہے مگر جب نویں کی باری آئی تو، کیوں دلاسے یاد ہے؟ ہم کھیتوں میں پہنچے تو جہاں اس نے بھٹی کی نشان دہی کی تھی وہاں راکھ اڑ رہی تھی۔ ہم نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو دلاسے کی مخبری کے مطابق بھٹی چلانے والا کاہن سنگھ کھیت

کی مینڈھ پر کھڑا تھا۔ بولا "ٹھہرو داروغے۔ کھٹیا اٹھا لاؤں۔ بیٹھو۔ گنے چوسو" اور جب میں نے پولیس کے سپاہیوں کے سامنے اپنی جھینپ مٹانے کے لئے ڈپٹ کر کہا کہ یہاں خاک کی جگہ راکھ کیوں اڑ رہی ہے تو وہ بولا "وہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں داروغے۔ جہاں دو تین مہینے شراب کی بھٹیاں چلتی رہی ہوں وہاں تو خاک کی جگہ راکھ ہی اڑے گی" بات کا ڈھب بتا رہا تھا کہ ہمیں مخبری ہونے کے بعد اسے بھی مخبری ہو گئی تھی۔ سو بڑے سے بڑے مخبر پر بھی ایسا وقت آ ہی جاتا ہے۔ پر یہ خادو۔ توبہ! ایک بار آیا۔ بولا۔ بیس سیر افیون کا کیس ہے میں نے کہا۔ بھنگ پی کے تو نہیں آئے۔ بولا قسم ہے محکمہ آبکاری کی۔ پوری بیس سیر افیون ہے۔ اب آپ سوچئے کہ بیس سیر افیون میں سولہ سو تولے افیون ہوتی ہے اور ہم نے ایک ایک چھٹانک افیون کے مقدموں میں آدھے آدھے صفحے کی شاباشیاں لی ہیں۔ میں یونہی دل لگی کے لئے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسٹیشن پر پہنچا۔ گاڑی آئی۔ سیکنڈ کے ایک ڈبے میں ایک سوٹڈ بوٹڈ مسافر بیٹھا تھا۔ خادو نے کہا یہی ہے۔ سپاہیوں نے مسافر کو گھیرے میں لے لیا، سامان کی تلاشی ہوئی تو چار بکسوں کے خفیہ پیندوں میں پانچ پانچ سیر افیون پڑی مہک رہی ہے۔ ضلع میں دھوم مچ گئی۔ اخباروں میں خبریں چھپیں اور آبکاری کی نوکری کا مزا آ گیا۔ اسی مقدمے پر میرے لئے پانچ سو روپے کے انعام کی سفارش ہوئی تھی۔ سو اس خادو کو بالکل سچا موتی سمجھئے۔ ایسے ایماندار مخبر ذرا کم ہی ملتے ہیں۔ کیوں خادو۔ اس اللہ بخش چنڈو والے کا کیا بنا؟"

خادو بولا "اللہ نگہبان ہو۔ وہ تو سائیں ابھی میں یاری ہی لگا رہا ہوں۔ چار بار سال سال کی قید بھگتی ہے تو اب بڑا کایاں ہو گیا ہے۔ جانے چنڈو کی شیشی کہاں رہتی ہے۔ حرامزادہ ہوا ہی نہیں دیتا۔ ایک بار اسے میرے ہاتھ میں شیشی دینے کا اعتبار آ جائے۔ پھر دیکھئے کیسے تنکرے کی طرح جھپٹتا ہوں۔ کل کہہ رہا تھا۔ مجھے ان آس پاس کی قبروں والوں کی قسم۔ تو مجھے بڑا گھنا لگتا ہے۔ میں نے کہا۔ چنڈو پیتا ہوں تو کیا گھنا بھی نہ لگوں۔ ہنس دیا پر بڈھے کا ایمان مجھ پر جم نہیں رہا۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ آخر کب تک۔ صبر کا پھل تو آخر خدا دیتا ہی ہے۔ ایک دن اڑنگے پر لا کے ایسا ماروں گا کہ دن کو تارے نکل آئیں گے۔ اللہ نگہبان ہو۔"

"اور یہ دلاسہ سنگھ ہے؟" لالہ تیج بھان نے ادھیڑ عمر کے سکھ کی طرف اشارہ کیا۔

دلاسہ سنگھ نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ وہ انسپکٹر کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ اور پھر اچانک تڑپ کر خادو سے بولا "ابے اُوپر کیوں چڑھا آرہا ہے۔ ہٹ کر کھڑا ہو۔ لالہ جی کو بات کرنے دے۔"

مگر لالہ جی نے سوائے اس کے کوئی بات نہ کی کہ "اس کی تعریف تو میں کر ہی چکا ہوں۔ میرا خاص الخاص آدمی ہے۔"

دلاسہ سنگھ کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے ٹرخا دیا گیا ہے۔ اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر ڈاڑھی میں دو انگلیاں ڈالیں اور ٹھوڑی کو پھر پھر ملا۔ پھر مجھے سلام کئے بغیر لالہ تیج بھان کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔

مجھے چند روز دفتر کی فضا اور بڑے بڑے رجسٹروں اور منشیات کے ٹھیکہ داروں سے مانوس ہونے میں لگے اور اپنے حلقے کے دُور دراز کے بعض قصبات میں بھنگ اور افیون کے ٹھیکوں کا معائنہ بھی کر آیا۔ ایک روز میں ایک ٹھیکہ دار کے ہمراہ ایک تانگے میں دفتر جا رہا تھا کہ میں نے کوچوان سے کہا "بھئی خُدا کے لئے تانگا احتیاط سے چلانا۔ تم تو سگریٹ میں چرس پی رہے ہو۔" کوچوان نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مسکرایا اور بولا "پی تو رہا ہوں بابو، پر آج ہی تو نہیں پی رہا۔ برسوں سے چرس بھی پل رہی ہے اور تانگا بھی چل رہا ہے۔"

ٹھیکہ دار نے پاگلوں کی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پھر کچھ اس قسم کی بے ہنگم آوازیں نکالیں جیسے مجھے کسی شعر پر داد دے رہا ہے "آہا ہا ہا۔ واہ۔ مزا آ گیا" وہ بولا "تیس برس ہو گئے آبکاری والوں سے نمٹتے ہوئے، پر بھگوان کی قسم۔ ایسا داروغہ آج ہی دیکھا کہ نوکری شروع ہوئے مہینہ بھی نہیں گزرا اور چرس کی بو پہچان لی۔ حد ہو گئی۔"

ٹھیکہ دار کی داد و تحسین نے کچھ ایسا پھُلا دیا کہ میں تانگے ہی میں بیٹھے بیٹھے انسپکٹر بن گیا۔ مگر جب دفتر میں آکر چوتھے ہفتے کی ڈائری انسپکٹر کی خدمت میں پیش کی تو وہ بولے "یہ آپ سیر و سیاحت ہی کرتے رہیں گے یا کبھی کوئی مقدمہ بھی پکڑیں گے؟"

"مخبری ہوگی تو پکڑلوں گا" میں نے اطمینان سے کہا

"اور اگر مخبری نہ ہوئی تو؟" لالہ تیج بھان نے پوچھا۔

"تو مجبوری ہے۔" میں نے اپنی طرف سے منطقی لحاظ سے معقول جواب دیا
مگر لالہ تیج بھان کو غصہ آگیا۔ "تو صاحب - اس طرح تو گورنمنٹ بھی آپ کو نوکری سے
جواب دینے پر مجبور ہو جائے گی۔"

"یعنی مخبری نہ بھی ہو۔ جب بھی کہیں سے کسی کو پکڑ لاؤں؟"

"جی ہاں۔" لالہ بولے۔

"کمال ہے۔" میں نے بے بسی سے اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

"کمال ہے۔" مجھے دوسرے روز پھر اسی تعجب کا اظہار کرنا پڑا کیونکہ ڈپٹی کمشنر نے بھی میری ڈائری پر دستخط کرتے ہوئے مجھے میری سستی اور کاہلی کے سلسلے میں "وارننگ" دے ڈالی تھی۔

لالہ تیج بھان نے نرمی سے کہا "یہ کوئی خاص بات نہیں۔ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مدتوں سے خادو میرے پاس نہیں آیا۔ جانے بیمار ہو گیا یا کہیں باہر چلا گیا۔ وہ آ جائے تو میں اسے آپ کے حوالے کر دوں کہ کوئی بھنگ ونگ ہی کا کیس پکڑوا دے۔ میرے لیے تو صرف دلاسہ سنگھ کافی ہے۔ اپنے چپراسی کو شہر میں بھیجئے کہیں سے خادو کو ڈھونڈھ لائے۔ کسی تکیئے میں پڑا ہو گا۔ مرے گا نہیں۔ چرسی لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔" میں نے چپراسی کو حکم دیا کہ خادو کو ڈھونڈھ لاؤ۔ اور جب میں شام کو گھر پہنچا تو خادو میرے ملازم کے پاس بیٹھا اپنی آنکھوں میں گھستی ہوئی مکھیاں اڑا رہا تھا اور اس کی سر کی منڈی ہوئی مستطیل پر گرد جمی ہوئی تھی مجھے دیکھتے ہی فرشی سلام کیا، اور پھر رونے لگا۔

میں اسے باہر برآمدے میں لے آیا اور ایک کھاٹ پر بٹھا کر پوچھا "بیمار ہو گیا؟"

"آپ تو سائیں بھولے بادشاہوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔" وہ بولا "بیماری کو مجھ سے کیا لینا ہے۔ میں تو ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں سائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ بیچارے سے کون سا گناہ ہو گیا۔ جس تکیے پر جاؤں، دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہوں۔ اللہ بخشے چنڈو والے پر آدھے مہینے سے ہاتھ پھیر رہا تھا پر اس کے پاس پرسوں گیا تو وہ بولا "جا جا حرامزدہ مخبر کہیں کا۔ چنڈو پینے آتا ہے۔ صورت تو دیکھو چنڈو پینے والے کی۔ چنڈو تو بادشاہوں کا نشہ

ہے اور پھر میں کہتا تھا نا کہ تو مجھے گھنا لگتا ہے۔ تیری آنکھوں میں حرص ہے، آج کے بعد میرے تکیے میں آیا تو قبر میں زندہ گڑوا دوں گا۔ قبروں میں تو رہتا ہی ہوں" سو سائیں اللہ نگہبان ہو۔ یہ کہتا تھا وہ۔ میں تو بالکل اشتہار بن گیا ہوں۔ جو دیکھتا ہے پڑھ لیتا ہے۔ بھنگ کا مقدمہ میں نے آج تک نہیں پکڑوایا اس لئے کہ بیچارے بُوٹی بیچنے والے پیسے دو پیسے ہی کا تو سودا کرتے ہیں۔ پر میں نے تنگ آکر کہا۔ لاؤ اللہ یار بھنگ والے کو ٹٹولوں۔ میں وہاں گیا۔ کونڈی میں گھنگھروؤں بھرا موسل چھما چھم چل رہا تھا۔ میں نے کہا وقت پر پہنچے۔ اکنی کا مونگرا دے ڈالے تو فوراً آپ کے پاس پہنچوں اور بسم اللہ تو کراؤں۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا "آؤ بھئی خادو کیسے ہو۔ تم تو بڑے بڑے نشوں کی دُنیا میں رہتے ہو۔ ہمارے یہاں تو تمہارا مُدتوں بعد آنا ہوتا ہے۔ لاؤ تمہاری ذرا سی خاطر کر دوں" اور سائیں پتہ ہے اس نے میری خاطر کیسے کی ؟ اُٹھا۔ اپنی ہی صورت کے دو کتے کھولے اور مجھ پر ہشکار دیئے۔ یہ پنڈلی کا زخم دیکھا ہے آپ نے ؟"

اس کی پنڈلی ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک بانس کی طرح برابر چلی گئی تھی اور ایک جگہ کتے کے کاٹے کا زخم تھا۔ جس پر کھرنڈ آ رہا تھا۔

وہ پھر رونے لگا اور رونی آواز ہی میں بولا "سچ کہتا ہوں سائیں۔ میرا کوئی دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ ورنہ میں تو ہمیشہ جس تکیے میں گیا دنوں میں اعتبار جما لیا۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک تکیے پر اُستاد کو پکڑوایا اور دوسرے دن اسی تکیے پر استاد کے خلیفے سے چرس خریدنے چلے گئے اور کسی نے شبہ بھی نہ کیا کہ اسی نے کل استاد کی بکری بٹھائی تھی۔ میں تو مارے شرم کے آپ کے پاس نہیں آیا۔ میں نے کہا ادھر لالہ جی مجھے اتنا بڑا مخبر بنا رہے ہیں اور ادھر مجھ پر کتے چھوڑے جا رہے ہیں۔ میں حلالی تو جب تھا کہ ادھر آپ آتے تھے ادھر ایک کیس دے کر آپ کی پہلی ڈائری ٹھاٹھ سے بھروا دیا، پر سائیں۔ اللہ نگہبان ہو۔ میری روزی پر کوئی ضرور لات مار رہا ہے۔ پتہ چلے تو۔۔۔"

اور وہ ایک لمبی دائرے دار گالی بک کر آنسو پونچھنے لگا۔

خادو کے آنسوؤں کا جادو مجھ پر نہ چل سکا۔ کیونکہ میرے لطیف احساسات پر تو ڈپٹی کمشنر کی "وارننگ" سوار ہو گئی تھی۔ میں نے اسے تسلی دے کر چلتا کیا اور سیدھا انسپکٹر کے ہاں جا نکلا۔ وہ اس وقت انگریزی شراب کے ٹھیکہ دار کی بیٹی کی شادی میں شمولیت کے لئے تیار ہو رہے ہے

تھے۔ مجھے یوں بے وقت اپنے ہاں دیکھا تو ایک کونے میں لے جاکر بولے "کوئی کیس ملا ہے؟"

"کیس کہاں ملا ہے لالہ جی" میں نے کہا "خادو ملا ہے؟"

"خادو ملا ہے تو سمجھئے کیس مل گیا" وہ اپنی نکٹائی کی جھریاں درست کرتے ہوتے مسکراتے۔

میں نے انہیں خادو کی بے بسی کی تفصیل بتائی تو وہ کچھ دیر تک ایک بُوٹ کی ٹو کو کدال کی طرح زمین پر مارتے رہے۔ پھر بولے "بات سمجھ میں نہیں آرہی" پھر دُوسرے بُوٹ کی ٹو سے تھوڑی سی مٹی کھودی اور بولے "فکر نہ کیجئے۔ میں کوئی انتظام کردوں گا کیس نہ ملے تو کیس پیدا کرنا چاہیئے"۔ پھر مجھے حواس باختہ دیکھ کر بولے "یہاں یونہی چلتا ہے صاحب۔ بڑے افسر یہی دیکھتے ہیں کہ کیس نہیں ملا۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کیوں نہیں ملا"

میں کھویا کھویا سا گھر واپس آگیا۔ ایک دو روز خادو کے انتظار میں گزرے تیسرے روز میں دفتر جانے کو تیار بیٹھا تھا کہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے دلاسہ سنگھ کھڑا تھا۔ بولا "چلئے ایک کیس پیش کروں"

میں نے کہا "بھئی دلاسہ سنگھ۔ تم تو لالہ جی کے کوٹے میں شامل ہو۔ میرے حصّے میں تو خادو آیا ہے۔"

بولا "لالہ جی کی اجازت سے آیا ہوں۔ سنا ہے خادو پر تو تکیوں والے کتے چھوڑ رہے ہیں۔ مخبر کا پردہ ایک بار اُٹھا تو مرتے دم تک کے لئے ننگا ہو گیا۔ ہمارا کاروبار شراب کی بھٹیوں کا ہے۔ اس لئے ہمارا سلسلہ باہر حلقوں سے ہے اور پردے شہروں میں اُٹھتے ہیں۔ کل ایک بھٹی پر ریڈ ہو رہا ہے لالہ جی نے کہا جاتے جاتے آپ کی ڈائری بھروا دوں۔ چنڈو کا کیس ہے میں ان گندے نشوں کی دُنیا میں اب تک نہیں آیا تھا پر آپ بھی ہمارے افسر ہیں اور سنا ہے صاحب ضلع نے آپ کو ڈانٹا ہے۔ سو اس نے صرف آپ کو نہیں ڈانٹا۔ دلاسے کو بھی ڈانٹ دیا ہے اور دلاسا زہر پی لے گا پر ڈانٹ نہیں پئے گا۔ اس وقت اینٹوں پر سر رکھے سب غٹ پڑے ہیں۔ راستے میں چار سپاہی لیجئے۔ میں چنڈو خرید کر اشارہ کردوں گا۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام"

چھاپہ کامیاب رہا۔پانچ ملزموں کا چالان ہوا اور میری ڈائری پر ڈپٹی کمشنر نے مجھے "گڈ" دیا۔

اس کے بعد ایک ہی مہینے کے اندر میں نے بھنگ کے چار، افیون کا ایک اور چرس کے دو کیس پکڑے اور ان سب کا مخبر دلاسہ تھا۔ایک کیس میں چرس ذرا سی کم تھی۔ دلاسے نے کہا۔آپ استغاثہ تو لکھئے۔ استغاثے کے آخر میں جب میں نے چرس کا وزن پوچھا تو دلاسہ بولا۔ تول لیجئے۔چرس تولی گئی تو سابقہ وزن سے ایک تولہ زائد نکلی۔میں نے حیران ہو کر دلاسے کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آنکھ ماردی اور میں نے استغاثہ کو ملزموں سمیت پولیس کے حوالے کر دیا۔

اس دوران میں ایک بار خادو سے سر راہے ملاقات ہوئی۔کان پر سگریٹ کا ایک ٹرا رکھے وہ ایک دیوار کا سہارا لئے کھڑا تھا۔میں نے مزاج پوچھا تو بولا "دمہ ہو گیا سائیں۔ سانس پیٹ میں سمانہیں رہی۔ہوا کا اتنا بڑا گولہ یہاں چھاتی میں گھس گیا ہے۔ اللہ نگہبان ہو" پھر وہ رونے لگا۔

مجھے دھڑا دھڑ کیس مل رہے تھے۔ اس لئے اس کے آنسو اس کے گالوں کے گڑھوں ہی میں بہہ گئے۔میرے دل پر نہ ٹپک سکے۔ میں نے کہا۔ "روتے کیوں ہو؟ محنت کرو۔سارا ملتان پڑا ہے۔تم تو صرف چار پانچ تکیوں سے نکالے گئے ہو اور یہاں ملتان میں تو ہر دسویں مکان کے بعد ایک تکیہ ہے۔"

اچانک اس کے تیور بدل گئے۔اس کی پتلیوں کے گدلے پن میں ڈراؤنی سی چمک پیدا ہوئی اور اس کے سیاہ حاشیوں والے تربوز کے بیجوں کے سے دانت ایک ساتھ نمایاں ہو گئے۔وہ بولا "جانتا ہوں سائیں جانتا ہوں۔ دلاسے نے آپ کو اکٹھے آٹھ مقدمے دیئے ہیں۔یہ سب میرے مقدمے تھے۔پر وہ حرامزادہ مجھے لوٹ لے گیا اور اسی نے میری مخبری کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔اب میں مقدمے تو کیا پکڑواؤں گا۔ہاں یہ دمہ دور ہو تو ایک چھرا دلاسے کے پیٹ میں اتارنے کا بڑا ہی شوق ہے" اور وہ مجھے سلام کئے بغیر سیٹیوں بھری کھانسی کے دھکے کھاتا ہوا مخالف سمت کو رینگ گیا۔

چند روز بعد میں دفتر سے گھر آیا تو وہ میرے ملازم کے پاس بیٹھا ایک ہاتھ سے آنکھوں میں گھستی ہوئی مکھیاں اڑا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں گڑے ہوئے سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے لئے مسلسل چٹکیاں بجا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو پہلے خوب رویا اور پھر بولا۔ "دو تین دن سے بھوکا بھی ہوں سائیں اور نشہ بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ نشہ تو خیر آپ کیا پورا کرائیں گے۔ چپہ بھر روٹی مل جائے تو دلاسے کا پیٹ چاک کرنے کے لئے کچھ روز اور زندہ رہ جاؤں۔ اللہ نگہبان ہو۔"

میں نے ملازم کو الگ لے جا کر کہا کہ وہ خادو کو کھانا کھلا دے اور پھر اسے چلتا کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر دوسرے تیسرے دن وہ پھر موجود تھا۔ رونے سے پہلے بے حیاؤں کی طرح مسکرایا تو میں نے دیکھا کہ اس کے نیچے کے دو دانت غائب ہیں۔ پھر ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ وہ چھلا بھی اس کے کان کی لو میں موجود نہیں جو استاد نے ضرورت سے زیادہ بھنگ پینے کی خوشی میں اسے دے ڈالا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو رونے لگا۔ بولا "نشہ ٹوٹ رہا تھا اور آپ جانیں نشہ گردن تڑوا دے گا پر نشہ نہیں ٹوٹنے دے گا۔ میں نے دانتوں اور کان کے دونوں تار بیچ کر سگریٹ بھر چرس لے لی۔ آدھی یہ میرے کان پر رکھی ہے۔ میں نے سوچا اکھڑے ہوئے دانتوں کو کوئی کب تک تار میں جکڑے پھرے۔ کبھی کسی نے مرے ہوئے گھوڑوں کو بھی اصطبل میں باندھا ہے؟ رہا استاد کا دیا ہوا چھلا سو اب کا ہے کو ملنگوں بھنگ پینے کا اشتہار لئے پھروں۔ جب بوٹی کا ایک منگرا بھی نصیب نہیں ہوتا اللہ نگہبان ہو۔"

میں نے اس سے آنے کا سبب پوچھا تو آنکھیں پونچھ کر بولا "وہی چپہ بھر روٹی کے لئے آیا ہوں سائیں۔"

میں نے جل کر کہا "کیا میں نے یہاں لنگر کھول رکھا ہے کہ چرسیوں لوفروں کو روزانہ کھانا ٹھنساتا پھروں۔ تم مخبر ہو۔ مخبری کرنا چاہو تو کرو اور سرکار سے انعام لو ورنہ مجھے بخشو۔ میں آبکاری کے ان داروغوں میں سے نہیں ہوں کہ اکنی کی بھنگ کے مقدمے کی خاطر مخبروں کو ہفتوں مہمانیاں کھلاتے رہیں۔ اگر کوئی کیس نہیں دے سکتے تو جاؤ کسی تکیے

میں پڑ رہو۔" پھر میں نے وہیں سے ملازم کو حکم دیا کہ آئندہ خادو کو میری اجازت کے بغیر گھر میں نہ گھسنے دے۔

وہ اس تمام دوران میں پلکیں جھپکے بغیر میری طرف دیکھتا رہا اور جب میں ملازم کو ہدایات دے چکا تو وہ آہستہ سے بولا "اجازت ہے؟"

میں نے کہا "تو اور کس طرح اجازت دی جاتی ہے؟"

"اللہ نگہبان ہو" وہ بولا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز ذلاسہ سنگھ نے مجھے ناجائز شراب فروشی کا "دو بوتلی" کیس پکڑوا دیا۔ میں استغاثہ لکھ کر اور ملزم کو پولیس کے سپرد کر کے گھر آیا تو خادو باہر دروازے سے لگا بیٹھا تھا اور میرے ملازم نے اندر سے زنجیر چڑھا رکھی تھی۔

میں نے چھوٹتے ہی کہا "دیکھو خادو مجھ پر تمہارا جادو ذرا مشکل ہی سے چلے گا۔ میں دیکھ چکا ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔ تم سے ایک بار کہہ چکا ہوں کہ میں نے چرسیوں لوفروں کے لئے ـــ"

"ایک کیس ہے" وہ کچھ یوں بولا جیسے ٹین کی چادر پر کنکر گر پڑے ہیں۔

"کیس ہے؟" گرمی سے نرمی کی طرف پلٹتے ہوئے میرے ذہن کو صرف یہی الفاظ سوجھے اور میرے سامنے آنے والے ہفتے کی ڈائری کے ورق کھل گئے۔

"جی" وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ٹن سے بولا۔

"کیا کیس ہے؟"

"چھوٹا سا کیس ہے۔ ایک آدمی بھنگ بیچ رہا ہے۔ پر کیس تو ہے سائیں۔"

"ہاں کیس تو ہے" میں نے اس سے اتفاق کیا "کہاں ہے؟"

"کالے منڈی میں"

"کب چلیں؟"

"ابھی چلئے۔ نیا نیا آدمی ہے۔ وقت بے وقت کی پروا نہیں کرتا۔ جب جائیے۔ ٹکے میں منگرا خرید لیجئے۔ آپ نے انگریزی سوٹ پہن رکھا ہے۔ پر وہ آپ کو بھی دے دے گا۔ بڑا ہی بھولا آدمی ہے۔"

"تو پھر چلو۔"

"چلئے۔ اللہ نگہبان ہو۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اُٹھا اور پھر جیسے چکرا کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور گھٹنے کانپنے لگے پھر اس پر کھانسی کا ایک دورہ پڑا اور وہ کمان کی طرح دوہرا ہو کر دیر تک کھانستا رہا۔ حتیٰ کہ کھانسی اس کے حلق سے سیٹیاں اور چیخیں بن کر نکلنے لگی۔

میں دروازہ کھلوا کر اندر سے ایک مونڈھا اٹھوا لایا مگر اس نے دھونکی کی طرح چلتی ہوئی سانسوں میں کہا۔ "نہیں جی۔ اس کی ضرورت نہیں۔ اللہ نگہبان ہو۔"

پھر وہ سیدھا ہو گیا۔ آستین سے آنکھیں پونچھیں۔ کان پر سے سگریٹ کا ٹرا اٹھا کر مجھ سے دیا سلائی مانگی اور سگریٹ جلا کر بولا "چلیئے۔"

تھانے تک اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ صرف سگرٹ پیتا اور چرس کی بُو پھیلاتا رہا۔ ہم تھانے کے پاس پہنچے تو وہ ایک بار پھر زور سے کھانسا اور اس کی ہر سانس کے ساتھ اس کے حلق سے کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ دور بہت سے آرہ کش ایک ساتھ لکڑیاں چیر رہے ہیں۔ میرے چہرے پر تردد کے آثار دیکھ کر وہ فوراً بولا "اس کھانسی اور اُس کھانسی میں بڑا فرق ہے سائیں۔ وہ کھانسی دمے کی تھی۔ یہ کھانسی چرس کی ہے۔ اُس سے سینہ پھٹتا تھا۔ اس سے نشہ پاؤں کے ناخنوں سے ماتھے کی ٹھیکری تک پھیلتا ہے۔ فکر کی بات نہیں۔ اللہ نگہبان ہو۔"

تھانے سے میں نے پولیس کے چند سپاہی ساتھ لئے اور کالے منڈی کا رُخ کیا۔ بہت سی نیم تاریک اور سیلی سیلی گلیوں میں سے گزرنے کے بعد وہ رُکا۔ اُس نے اپنے ہڈیوں بھرے ہاتھ سے میرا ہاتھ دبایا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا "وہ سامنے جو دروازہ کھلا ہے نا۔ اس میں آپ داخل ہو جائیے۔ سپاہیوں کو باہر رہنے دیجئے۔ آپ خود جا کر ٹکے کا منگرا خرید لیجئے۔ کیس یوں آپ کے سامنے رکھا ہے جیسے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ چلئے ——— بسم اللہ کیجئے۔ اللہ نگہبان ہو۔"

وہ پلٹ کر گلی کے موڑ کی طرف رینگ گیا اور میں اس کے مشورے کے مطابق کھلے

دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ خاصی معتبر صُورت کا ایک آدمی پانچ آدمیوں کے درمیان بیٹھا نئے نئے موسل سے نئی نئی کونڈی میں بھنگ گھوٹ رہا تھا اور پانچوں آدمی مٹی کے نئے نئے مونگروں میں بھنگ پی رہے تھے ایک طرف دو نئے نئے گھڑے رکھے تھے۔ جن کے دہانوں پر سُرخ ململ کی نئی نئی صافیاں بندھی تھیں اور چھوٹے سے آنگن کے ایک کونے میں تین کالے کالے بچے کھجور کی گٹھلیوں سے کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔

معتبر صورت آدمی میری طرف دیکھ کر ذرا سا چونکا اور موسل چلانا بند کر دیا۔ مگر جب میں نے مسکرا کر بُوٹی کا ایک منگرا طلب کیا تو اس نے اپنے نیچے سے پیڑھی نکال کر میری طرف بڑھا دی اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ "بسم اللہ" وہ بولا۔ "خشخش والی کہ سادہ؟"

"سادہ" میں نے کہا تاکہ دیر نہ لگے اور گلی میں کوئی آتا جاتا پولیس کے سپاہیوں کو نہ دیکھ لے۔ ایک منگرا اٹھا کر اس نے ایک گھڑے کو جھکایا جس میں دڑ دڑ کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ گھڑا بھنگ سے لبریز رکھا تھا۔ ایک اکنّی جس پر میں نے پہلے سے چاقو کی نوک سے اپنے دستخط کر رکھے تھے۔ اس کی طرف پھینک کر میں نے منگرا ہاتھ میں لے لیا اور مجوزہ منصوبے کے مطابق کھانس دیا۔ سپاہی لپک کر آئے اور ملزم کے چہرے سے لے کر اس کے ہاتھوں کے ناخنوں تک پر ہلدی کھنڈ گئی۔ میں نے بھرے ہوئے دونوں گھڑوں کو سربمہر کر کے استغاثہ لکھا، اور ملزم میراں بخش کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ تینوں بچے چیخ چیخ کر روتے ہوئے میراں بخش کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ ایک عورت کوٹھے سے نکل کر بین کرنے لگی۔ آس پاس کی چھتوں پر بکھرے بالوں اور میلے چہروں والی عورتوں کے ٹھٹ لگ گئے اور میراں بخش ہکا بکا کھڑا سامنے کھلے دروازے سے پار دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے روز میں دفتر گیا تو خادو پہلے سے دروازے میں موجود تھا۔ میں اندر کرسی پر جا کر بیٹھا تو وہ بھی اندر آ گیا اور میرے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر بولا۔ "کیس کیسا تھا سائیں؟"

"بہت اچھا تھا" میں نے کہا۔ "پورے دو گھڑے لبالب بھرے رکھے تھے۔"

"پورے دو گھڑے؟" وہ ضرورت سے زیادہ حیران نظر آنے لگا۔

ذرا سے وقفے کے بعد وہ بولا۔ "ایک بات کہوں سائیں؟"

"کہو"۔ میں نے کہا۔

"اللہ نگہبان ہو"۔ وہ بولا "میراں بخش کے ساتھ ذرا سی رعایت ہو سکے گی؟"

"رعایت؟" میں نے پوچھا "رعایت کیسی؟"

"بات یہ ہے سائیں"۔ خادو میری کرسی کے ساتھ لگ کر میری پنڈلی دبانے لگا۔ "میراں بخش سے میں نے ہی یہ کام شروع کرایا ہے۔ بے چارا بالکل بھولا ہے۔ پہلے کھجوروں کی چھابڑی لگاتا تھا۔ نیا نیا ہے۔ قید نہ ہو۔ جرمانہ ہو جائے بس اتنی رعایت چاہیئے"۔

میں نے سب انسپکٹر آبکاری کی حیثیت سے کہا۔ "وہ ملزم ہے اور ملزم سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی"۔

"پر سنیئے تو سائیں"۔ خادو نے اچانک بچے کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ "یہ میراں بخش میرا بڑا بھائی ہے نا۔ جرمانہ ہو جائے تو اس کو پکڑوانے کا مجھے جو انعام ملے گا اُسے میں جرمانے میں دے دوں گا۔ اللہ نگہبان ہو"۔